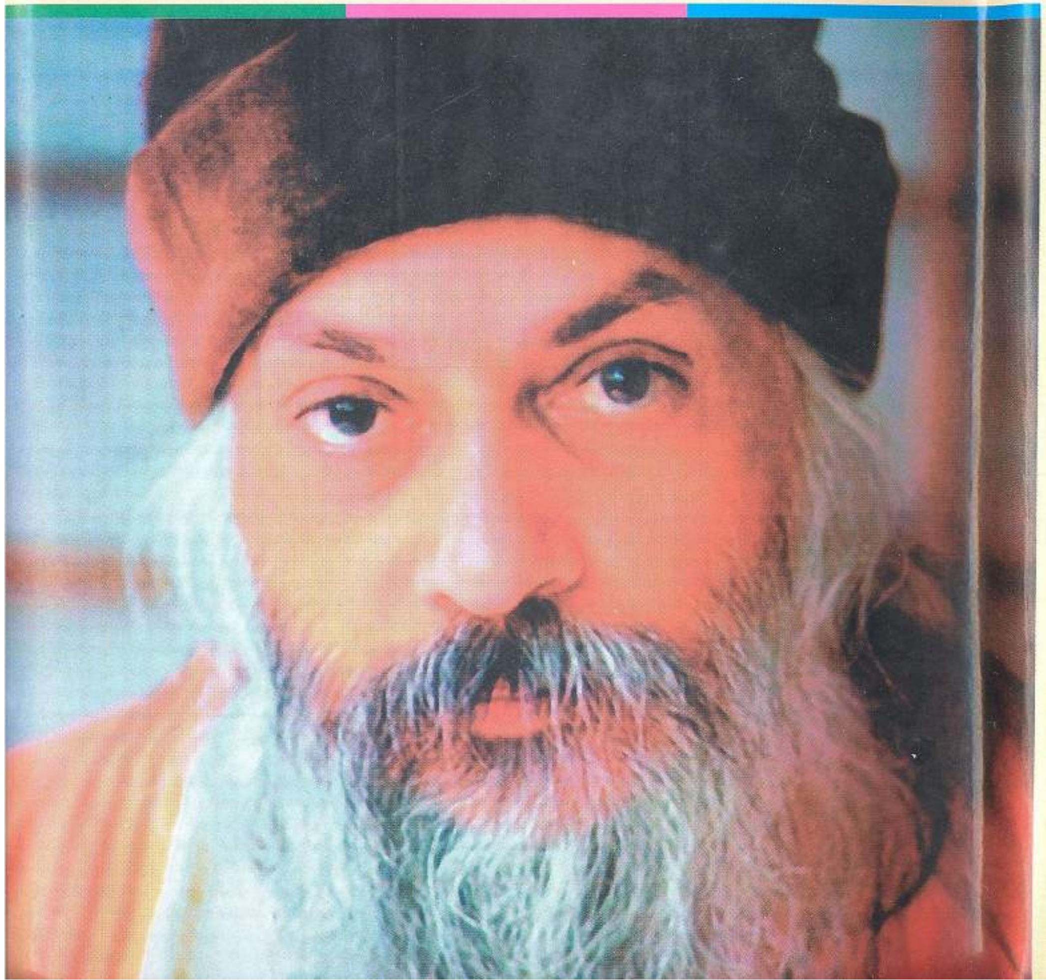
Revolution in Education

تعلیمی انقلاب

اوشو (گرور جنیش)

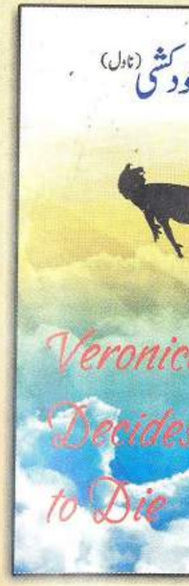
ترجمہ: سید علاؤ الدین

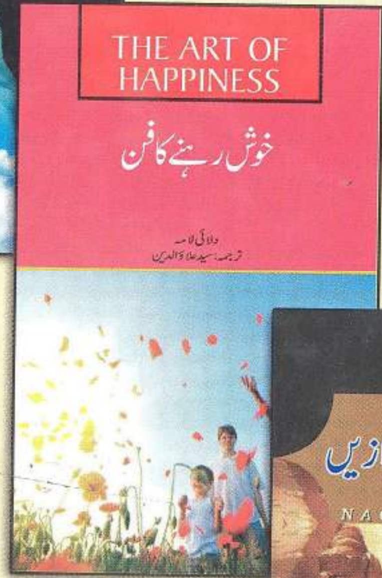


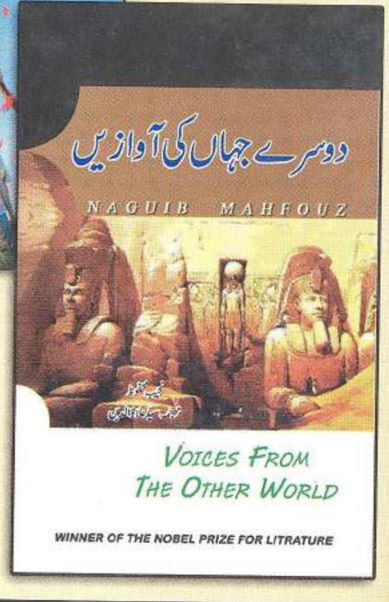
تعلیمی انقلاب

اوشو (گرور جنیش)

مترجم کی دیگر کتب









مترجم سید علاؤ الدین مولانا شبلی نعمانی کی سرزمین ضلع اعظم گڑھ، یوپی بھارت میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے پہلے عشرے کے ابتدائی برسوں میں پاکستان آگئے۔ کراچی یونیورسٹی سے .M.A سیاسیات اور اسکے بعد .M.A صحافت کی اسناد حاصل کیں۔ نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازمت کے دوران بینکنگ کا اعلیٰ ترین ڈپلومہ .D.A.I.B.P حاصل کیا اور AVP کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اس سے قبل سٹی بک پوائنٹ انکے تراجم پر مشتمل ایک درجن سے زائد کتابیں شائع کرچکا ہے۔

Revolution In Education کا اردو ترجمہ

تعلیمی انقلاب

تصنیف: اوشو

ترجمہ: سید علاؤالدین

CITY BOOK POINT

Naveed Square, Urdu Bazar, Karachi

Ph # 021-32762483,

Email: citybookurdubazaar@gmail.com

باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت اور معیاری کتاب

بیاد

HASAN DEEN

ادارہ City Book Point کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں ادارے کا مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہونا لازمی نہیں۔

جملہ حقوق ترجمہ بحق پبلشر محفوظ ہیں

نام کتاب :تعلیمی انقلاب

تصنیف :اوشو

ترجمہ :سید علاؤالدین

ناشر :سٹی بک پوائنٹ

کمپوزنگ :عبداللہ کمپوزنگ سینٹر

0333-3596334:

اشاعت :2015ء

قیمت :-/300روپے

﴿فہرست﴾

انتساب

پیارے بھائی جان،

محترم سید صلاح الدین صاحب

اور

پیاری بھابھی جان

محترمہ شمع صلاح کے نام

مترجم

استاد' سماج' انقلاب

میں چند باتیں استادوں اور سماج کے متعلق آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں جنہیں ان میں دیکھتا ہوں۔ شاید آپ کے اور میرے خیالات میں کوئی مطابقت نہ ہو ممکن ہے میں موجودہ نظام تعلیم کے لیے معاندانہ نظریہ رکھتا ہوں۔ میں نہ تو ماہرِ تعلیم ہوں اور نہ سماجی مصلح پھر بھی یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں تعلیم اور سماج کے بنیادی پہلوؤں پر گفتگو کر سکتا ہوں۔

تعلیم میں کسی سچائی کے ظہور کا ہونا ناممکن عمل سمجھنا چاہیے گزشتہ پانچ ہزار برسوں سے اس بات پر غور کرتے رہے لیکن تعلیم کی موجودہ صورت اس کا ڈھانچہ اور اس سے پیدا ہونے والے لوگ غلط اور غیر معیاری ہی رہے کیوں کہ اس نے صرف اور صرف غیر صحت مند اور الجھے ہوئے ذہن والے رہنما پیدا کیے۔ سماجی کارکنوں اور ماہرین کی سوچ بھی بیماری کا شکار اور غیر صحت مند ہے ورنہ بنی نوع انسان کی زندگیاں اور ان کی سوچ قطعی مختلف ہوتی چونکہ میں نہ تو ماہر تعلیم ہوں اور نہ ہی میرا تعلق سماجی کارکنوں میں سے ہے اس لیے شاید میں وہ باتیں بتا سکوں جنہیں براہ راست دیکھ رہا ہوں۔

وہ لوگ جو صحیفوں و بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کے لیے ان مسئلوں سے زیادہ ان کا حل اہم ہے میں چونکہ تعلیمی قواعد وضوابط سے لاعلم ہوں اس لیے اس کے مسائل پر براہ راست ہی گفتگو کرتا ہوں۔

/ سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ استاد اور سماج کے درمیان قائم رشتے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ وہ انتہائی خطرناک اور مہلک ہے، وہ رشتہ ہے کیا؟ رشتہ یہ ہے کہ ٹیچر یا استاد ایک تابع محنت کش ہوتا ہے جبکہ سوسائٹی یا سماج آقا اور مختار کل۔ سوسائٹی' استاد سے کس کام کی توقع کرتی ہے؟ معاشرہ چاہتا ہے کہ استاد پرانی رقابت اور دشمنی کو جو ہزاروں برسوں سے ان کے ذہنوں میں پروان چڑھتی رہی ہے اسے نوجوانوں کے ذہنوں میں مزید پختہ کریں۔ وہ بوڑھے لوگ جو قریب المرگ ہیں یا مروں جیسے' اپنے ترکے کے طور پر استادوں کے ذریعے وہ سب کچھ نئی نسل کے ذہنوں میں بھر دینا چاہتے ہیں۔ حیرت انگیز بات ہے کہ معاشرہ اس قسم کی خدمات استادوں سے لینا چاہتا ہے اور ٹیچرز اس خدمت کی انجام دہی میں مسلسل

لگے رہتے ہیں۔

استادوں کی یہ سخت توہین بلکہ بے آبروئی ہے' یہ بات اس لیے باعث رسوائی ہے کہ ان سے وہ کام لیا جا رہا ہے یا پھر یوں سمجھیں کہ وہ امراض جن میں پرانی نسلیں مبتلا رہی ہیں انہیں استادوں کے ذریعے نئی نسلوں تک منتقل کیا جاتا ہے کیونکہ یہ سوسائٹی کی خواہش ہے۔

یہ خواہش اس لیے ہے کہ پرانا ڈھانچہ' اس سے منسلک مخصوص مفادات اندھا یقین جو اس ڈھانچے سے متعلق ہے وہ ختم ہونا نہیں چاہتا۔ وہ ساری چیزیں چاہتی ہیں کہ سوسائٹی کے اندر قائم و دائم رہیں۔

چونکہ ٹیچر اس کام کو انجام دیتے ہیں اس لیے ان کی عزت کی جاتی ہے اگر استاد کی بے جا تعریف اور عزت واحترام نہ کیا جائے تو اس سے اس کام کو انجام دینے کے لیے نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ استاد کو انتہائی قابلِ احترام گردانا جاتا ہے اور ان کے مشوروں کو سنا جاتا ہے کیوں...... کیونکہ سوسائٹی چاہتی ہے کہ ان کے ایمان و یقین کا مکمل نمونہ ورثے کے طور پر ٹیچرز کے ذریعے ان کے بچوں تک منتقل ہو جائے۔

اگر باپ ہندو ہے تو چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا ہندو بنے اور ایک مسلمان چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا اس کے مرنے سے پہلے مسلمان بن جائے۔ ذہنوں میں پوری طرح منتقل کردے تاکہ وہ ان اختلافات کو مزید بڑھاتا رہے اور یہ کام ٹیچرز انجام دیتے ہیں۔ پرانی نسل کے لوگ اپنے اندھے یقین کو نئی نسل کے ذہنوں میں ٹھونس دینا چاہتے ہیں۔ اپنے صحیفوں' اپنے مذہبی پیشواؤں' غرض ہر چیز نئی نسل کو منتقل کر دینا چاہتے ہیں اور یہ کام اسکولوں کے استادوں کے ذریعے انجام پذیر ہوتا ہے لیکن نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں؟

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا میں مادی اثاثے اور جسمانی آسائشوں میں تو اضافہ ہو رہا ہے لیکن ذہنی صلاحیتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے جب تک بچوں کے ذہنوں پر پرانے خیالات کا بوجھ برقرار رہتا ہے اس وقت تک ان کی ذہنی استعداد نہیں بڑھ سکتی۔ ایک چھوٹے معصوم بچے کے سر پر پانچ ہزار سال پرانی تہذیب وثقافت کا بار ہوتا ہے اور اس معصوم بچے کی پوری زندگی اس بوجھ سے پارہ پارہ ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے بچے کے ذاتی شعور کی لو نہیں بڑھ سکتی۔

مادی اثاثہ بڑھتا ہے کیونکہ ان کے بزرگوں نے جو کچھ چھوڑا ہے بچے ان میں اضافہ

کرتے رہتے ہیں لیکن ذہنی استعداد نہیں بڑھ پاتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذہنوں کو نا درست طریقون سے پروان چڑھایا گیا ہے بچہ بلا کسی ہچکچاہٹ کے ورثے میں ملی عمارت پر ایک منزل کا مزید اضافہ کر دیتا ہے اور اس کام کو انجام دینے کے بعد وہ خوشی محسوس کرتا ہے ادھر باپ بھی خوش ہو کر اطمینان کا اظہار کرتا ہے کہ اس کے بیٹے نے مزید ایک منزل کا اضافہ کر دیا لیکن اگر کوئی ان خیالات اور تصورات کو سنوارنے کی کوشش کرے جو گیتا میں بیان ہوئے ہیں اور پھر مہاویرا' بدھا' کرشنا اور راما کے خیالات میں تو وہ بڑی مشکلات میں گرفتار ہو جائے گا چنانچہ یہ ضروری ہوا کہ آپ انہی حدود میں رہیں یعنی ورثے میں ملی ذہنی ڈھانچے کی حد میں۔ کوئی نیا ڈھانچہ نہیں تعمیر کیا جا سکتا' یہ کوشش ہزاروں برسوں سے جاری ہے کہ بیٹے اپنے باپ سے سبقت نہ لے جائیں اور اسی ذہنی حد میں رہیں جس میں اس کا باپ تھا اور اس کے بہت سے محرکات ہیں۔

چنانچہ اس دنیا میں مادی اثاثے تو بڑھتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ذہنی درماندگی اور پستی میں بھی اضافہ ہوتا ہے ایسی صورت میں کہ ذہن چھوٹا اور پست ہو اور اشیائے تعیش کی بھرمار تو خطرات بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ جیسے ہم مادی اشیاء میں ترقی کریں اور اپنے اجداد کو پیچھے چھوڑ دیں اسی طرح ہمیں ذہنی اور روحانی ترقی میں بھی انہیں پیچھے چھوڑ دینا چاہیے اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو اپنے اجداد کو سبکی کا شکار نہیں کرتے بلکہ ایسا کرنا ان کی عزت وعظمت میں اضافہ ہوگا۔ ایک صحیح باپ وہی ہوتا ہے جس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا اسے ہر میدان میں پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائے لیکن یہ بات خطرناک ہوتی ہے جب ایک باپ یہ چاہے کہ اس کا بیٹا کسی بھی میدان میں اس سے آگے نہ نکلنے پائے' اسکولوں کے استاد اس سلسلے میں باپ کی مدد کرتے ہیں کہ بچہ اس سے آگے نہ نکل سکے۔

یہ پاگل پن ہوگا اگر ہم کرشنا' مہاویرا یا بدھا سے آگے سوچنے کی ابتدا کر دیں کیونکہ یہ ان کی شان میں گستاخی کرنے کے مترادف ہوگا مزید یہ کہ اس طرح پوری تعلیم ماضی سے متعلق ہو کر رہ جائے گی بجائے اس کے کہ مستقبل سے متعلق ہو۔

ارتقا سے متعلق کوئی کام یا ایجاد واختراع سے متعلق کوئی عمل ہمیشہ مستقبل کے لیے ہوتا ہے جبکہ ہمارا پورا تعلیمی نظام ماضی پر محیط ہوتا ہے۔ ساری سوچ' سارا تصور' ساری فکر انگیزی

ماضی سے مستعار ہوتی ہے اور ماضی اسے کہتے ہیں جو مرنے کے بعد معدوم ہو چکا ہو ہم اپنے بچوں کے ذہنوں میں ہزاروں برسوں پرانی چیزیں ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں ہم صرف پرانے خیالات ہی نہیں بلکہ اپنے بچوں کے ذہنوں میں ایسے بت تعمیر کر رہے ہیں تا کہ وہ خود کو پرانی روایات کا ایک اچھا پیرو کار ثابت کر سکیں ایسے بچوں کا ثنا خواں کون ہے؟ یہ کام استاد کے ذریعے لیا جاتا ہے اس طرح سوسائٹی' مذہب اور مملکت یا ریاست کے رہنما استادوں کا استحصال کرتے ہیں۔

ٹیچر کو یقین دلا دیا گیا ہے کہ وہ علم کو دور تک پھیلا رہے ہیں جبکہ وہ علم پھیلانے والے نہیں بلکہ وہ علم کے رکھوالے اور علمی صورت حال کو قائم رکھنے والے ہیں اس علم کو جو ماضی میں آگے بڑھا اور بہتر ہوا تھا اب وہ علم کی ترقی میں ایک رکاوٹ ہیں وہ ماضی کی حدود کو پار نہیں کرنے دیتے۔ چنانچہ نتیجتاً ہم مسلسل نادانی کرتے جا رہے ہیں' پرانی چیزوں کو ختم نہیں ہونے دیا جاتا۔ یہ بات سیاستداں بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں وہ ٹیچر کا استحصال کر رہے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اپنے اس استحصال کا ادراک ٹیچر کو نہیں ہے کہ سوسائٹی کی خدمت کے نام سے اس کا استحصال ہو رہا ہے۔ قسم قسم کے استحصالی حربے اختیار کیے جا رہے ہیں۔

میں ایک بار ٹیچر کے ایک اجتماع سے خطاب کرنے گیا یہ ٹیچرز ڈے یا استادوں کا دن تھا۔ میں نے ان سے پوچھا ''اگر ایک استاد ملک کا صدر بنتا ہے تو اس میں استاد کی کون سی قدر افزائی ہوئی؟ ٹیچر کے صدر بننے میں استاد کی کیا عزت افزائی ہوئی؟ مجھ سے پوچھیں تو اگر ایک ملک کا صدر ٹیچر بن جائے تو میں یقیناً سمجھوں گا کہ ٹیچر یا استاد کو عزت ملی ہے۔

اگر ایک ملک کا صدر یہ سمجھے کہ اس کا منصب بے کار محض ہے اور وہ استاد بننے میں خوشی محسوس کرے اور ٹیچر بننا چاہے اور بن جائے' تو ہم یقیناً یہ سمجھیں گے کہ استاد کو عزت کے قابل گردانا گیا لیکن اگر ایک ٹیچر اپنے ملک کا صدر بن جاتا ہے تو اس طرح سیاستداں کی توقیر بڑھی نہ کہ ٹیچر کی اگر ایک استاد ملک کا صدر بن کر خوشی محسوس کرتا ہے تو ٹیچر میں کوئی خرابی یا خامی ہے جو اسے اسکول کا ہیڈ ماسٹر' انسپکٹر یا پھر وزیر تعلیم بننے پر اکساتی ہے؟

عزت وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی مرتبہ ہو' مرتبہ وہاں ہوتا جہاں دبدبہ' طنطنہ اور وقار ہو۔ ہماری سوچ کا پورا ڈھانچہ یہ ہے کہ اگر کوئی چیز سب سے بلند و بالا ہے تو وہ حکومت ہے چنانچہ

سیاستداں ہی سب کچھ سمجھا جاتا ہے جبکہ دوسری تمام چیزیں حقیر۔

سیاستداں جانتے یا نہ جانتے ہوئے اپنے خیالات کو استاد کے ذریعے بچوں کے ذہنوں میں ٹھونستے رہتے ہیں۔ یہی کام پجاری اور پروہت بھی سر انجام دیتے رہتے ہیں۔ مذہب کے نام پر تعلیم میں یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے' ہر مذہب اپنے ایمان وعقیدے کو صحیح یا غلط طور پر بچوں کے ذہنوں میں ڈالتا رہتا ہے اور یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب بچے ناسمجھی کی عمر میں ہوتے ہیں اور غور وفکر کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ نسل انسانی کے خلاف اس سے بڑا کون سا جرم ہو سکتا ہے۔

اس سے بڑا کون سا جرم ہو سکتا ہے کہ بچوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ گیتا میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہی سچ ہے یا یہ کہ اگر خدا ہے تو وہ مہاویر یا کرشنا ہے (نعوذ باللہ)؟ کسی بچے کے ذہن میں اس قسم کی باتیں ٹھونسنا جو معصوم اور دُنیا سے ناواقف ہوتے ہیں' انتہائی بُرا جرم ہے۔

ابھی جلد ہی ہندوستان میں آزادی کا سوال اٹھا' چنانچہ سیاستدانوں نے کہا کہ استادوں اور طالب علموں کو آزادی کی تحریک میں شامل ہونا چاہیے اور جب وہی سیاستداں اقتدار میں آئے تو کہنے لگے کہ طالب علموں اور ٹیچروں کو سیاست سے دور رہنا چاہیے۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ کہتے ہیں ''نہیں' یہ ضروری نہیں کہ طالب علموں کو سیاست سے دور رکھا جائے دونوں یعنی اساتذہ اور طلب علموں کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے'' یہی کمیونسٹ اگر کل اقتدار میں آ گئے تو کہیں گے کہ اب ان کا سیاست میں حصہ لینا ضروری نہیں۔ سیاستدانوں کے اقتدار میں آنے کے بعد جو کچھ ان کے مفاد میں ہو' وہی صحیح ہوتا ہے اور یہ کوشش ہوتی ہے کہ اساتذہ اور طلباء' دونوں یقین کر لیں کہ وہی بات صحیح ہے جو وہ کہہ رہے ہیں۔

میرے نزدیک ایک شخص اسی وقت ٹیچر ہو سکتا ہے اگر اس کے اندر سرکشی کی طاقتور لو (آگ) روشن ہو۔

ایک ٹیچر کے اندر اگر سرکشی کی آگ نہ روشن ہو تو وہ پھر استاد کی بجائے ایک ایجنٹ ہو گا۔ خواہ وہ کوئی پالیسی ہو' کوئی مفاد ہو۔ یہ پالیسی یا مفاد سوسائٹی کا ہو سکتا ہے' مذہب اور سیاست کا بھی۔ ہر ٹیچر کے اندر سرکشی (REBELLION) کی روشن آگ کا ہونا بہت ضروری ہے جو اس کی سوچ اور عمل سے ظاہر ہو۔

لیکن کیا آزاد سوچ وفکر کی وہ آگ ہمارے اندر روشن ہے؟ اگر نہیں تو پھر کیا ہم ایک

بیوپاری کے علاوہ بھی کچھ ہیں؟

ٹیچر ہونا بہت بڑی بات ہوتی ہے' ٹیچر ہونے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ کیا ہم نے اس بارے میں کبھی غور کیا؟

آپ بچوں کو پڑھا رہے ہوں گے جیسا کہ پوری دنیا میں پڑھائے جاتے ہیں کہ وہ دوسروں سے محبت کریں لیکن آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ تعلیم کا پورا نظام' پورا ڈھانچہ محبت پر نہیں رکھا گیا بلکہ وہ تو مقابلے اور مسابقت پر ہے؟ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ محبت کی تعلیم دیتے ہیں لیکن تمام تر انتظامات تو مقابلے اور مسابقت کے ہیں جہاں مقابلہ اور مسابقت ہوگی وہاں محبت اور پیار نہیں ہوسکتا۔ مقابلہ تو حسد اور جلن کی ایک قسم ہے' حسد کی ایک سلگتی ہوئی قسم' آپ پڑھا کیا رہے ہیں؟

جب ایک طالب علم کلاس میں اول آتا ہے تو دوسرے طالب علم سے کہا جاتا ہے کہ تم پیچھے رہ گئے جبکہ تمہارا ساتھی اول آیا۔ آپ اسے خوشامد کی تعلیم دے رہے ہیں' مقابلہ کرنے کی اور آگے نکلنے کی۔ آپ اسے خود پسندی اور اپنی ذات کے بارے میں غلو اور خود پرستی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ان سے کہتے ہیں کہ وہ جو اول آیا ہے وہ تم سے برتر ہے اور وہ جو پیچھے رہ گیا وہ کمتر ہے۔ کتابوں سے یہ پڑھاتے ہیں کہ تمہیں محبتی اور منکسر المزاج ہونا چاہیے جبکہ سارے انتظامات انہیں نفرت کرنا سکھا رہے ہوتے ہیں کہ تم حسد کی آگ میں جلو اور اول آؤ۔ وہ شخص جو اول آتا ہے اسے طلائی تمغہ اور میرٹ سٹوفکیٹ دیئے جاتے ہیں۔ اسے ہار پھول پہنائے جاتے ہیں اس کی تصاویر کھنچتی ہیں اور دوسرے جو پیچھے رہ گئے سسٹم اس کی توہین کرتا ہے۔

جب تم کسی کی توہین کرتے ہو کہ وہ پیچھے رہ گیا تو کیا اس کی انا اور خودی کو مجروح نہیں کرتے اور اسے آگے بڑھنے کے لیے مہمیز نہیں کرتے؟ جب تم اول آنے والے کو عزت و تکریم سے سرفراز کرتے ہو تو کیا اس کی انانیت کو بڑھاوا نہیں دیتے؟ جب بچوں کو انا پرستی' نفرت اور مقابلے کے ماحول میں تربیت دی جائے گی تو پھر محبت اور چاہت کے جذبات کیونکر پیدا ہوں گے؟ محبت اور چاہت تو اس ہستی کو آگے بڑھانا چاہتی ہے جس سے محبت کرتی ہے۔ محبت کرنے والے تو ہمیشہ پیچھے رہنا پسند کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا محبوب آگے ہو۔

اس بات کو واضح کرنے کے لیے میں ایک چھوٹی لیکن دلچسپ حکایت سناتا ہوں۔ تین صوفی بزرگ تھے جنہیں سزائے موت ہوگئی۔ نام نہاد مذہبی لوگ ہمیشہ سچے مذہبی بزرگوں کے مخالف ہوتے ہیں۔ تینوں ایک لائن میں بیٹھے سزائے موت کا انتظار کر رہے تھے جلاد پھانسی دینے کے لیے ایک ایک نام پکارے گا اور انہیں پھانسی پر چڑھا دے گا۔

جلاد نے ایک نام پکارا ''نوری'' کہ وہ آگے بڑھے۔

لیکن وہ شخص جس کا نام نوری تھا اس کی بجائے ایک دوسرا شخص آگے بڑھا اور کہا کہ ''پہلے مجھے پھانسی دو''

جلاد نے کہا کہ تمہارا نام تو نوری نہیں ہے' تمہیں مرنے کی جلدی کیوں ہے؟

آگے بڑھنے والے شخص نے جواب دیا ''میں نوری سے محبت کرتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ جب مرنے کا سوال ہو تو آگے ہونا چاہیے اور اگر زندہ رہنے کا سوال ہو تو پیچھے رہو۔ میں اپنے دوست کی موت سے پہلے مر جانا چاہوں گا اگر یہ زندہ رہنے کا مسئلہ ہوتا تو میں چاہتا کہ میرا دوست زیادہ دنوں تک جیئے۔'' محبت تو اسے کہتے ہیں اور مقابلہ اور مسابقت کیا کہتی ہے؟ مقابلہ یہ سبق دیتا ہے کہ جب مرنے کا معاملہ ہو تو پیچھے رہو اور اگر زندہ رہنا ہو تو آگے آجاؤ۔ کیا دنیا ایک اچھی جگہ ہو سکے گی جب مقابلے اور مسابقت کا زہر بچوں کے ذہنوں میں بھرا جارہا ہو؟ جب ایک بچہ سب سے آگے نکلنے کی سعی کر رہا ہو اور دوسرے اسے پیچھے چھوڑ دینا چاہتے ہوں اس طرح بیس برس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ زندگی میں کیا کرے گا؟ وہ تو وہی کرے گا جو کچھ اسے پڑھایا گیا ہے۔

ہر شخص دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگا ہوا ہے چپراسی سے لے کر صدر تک' ہر شخص دوسرے کو نیچے کھینچ رہا ہے۔ اس جدوجہد میں اگر ایک چپراسی صدر بن جائے تو ہم کہتے ہیں کہ واہ واہ کتنے پروقار مقام پر پہنچ گیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑی زیادتی کوئی دوسری نہیں ہوسکتی کہ ایک شخص کو آگے لانے کے لیے دوسرے کو پیچھے کھینچ لیا جائے لیکن ہم تعلیم کے نام پر ہی زیادتی کیے جارہے ہیں اور اسے تعلیم کا نام دیتے ہیں۔

دنیا میں اس زیادتی کے ہوتے جہاں مسلسل جنگ جاری رہے تو کوئی حیرانی کی بات نہیں جہاں اس قسم کی تعلیم دی جارہی ہو۔ جہاں جھونپڑیوں کے قریب ہی محل تعمیر کیے جارہے ہوں تو

تعجب کیسا اگر محلوں میں رہنے والے لوگ جھونپڑیوں میں کسمپرسی کی زندگی گزارنے والوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں؟ کچھ لوگ انتہائی غریب ہیں اور دوسروں کے پاس دولت و ثروت کی بھرمار اور انہیں یہ تک نہیں معلوم کہ اس دولت کو کیا کرنا چاہیے یہ سب کچھ موجودہ تعلیمی نظام کے باعث ہے اور اساتذہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ دنیا میں اس قسم کی تعلیم کے ذمہ دار اساتذہ ہیں' وہ استحصال کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں' بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے نام پر' استاد مخصوص مفادات کے ہاتھوں ایک ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

اگر تعلیم یہی ہے تو بہتر ہوگا کہ اسے یکسر ختم ہی کر دیا جائے' شاید اس طرح آدمی زیادہ اچھا ہوگا۔ جنگل میں رہنے والا' بے پڑھا لکھا شخص زیادہ اچھا ہوگا کیونکہ اس میں محبت کا عنصر زیادہ اور مقابلے کا کم ہوگا۔ اس میں دماغ سے زیادہ بڑا دل ہوگا۔

ہم بچوں کو وہ کچھ پڑھاتے ہیں جو اس کے برخلاف ہوتا ہے جو ہم انہیں بنانا چاہتے ہیں' ہمارا پورا تعلیمی نظام ہی یہی سکھاتا پڑھاتا ہے۔ ہم کیا تعلیم دیتے ہیں؟ ہم ہمدردی اور کشادہ دلی پڑھاتے ہیں لیکن مقابلے اور مسابقت سے بھرے ہوئے ذہن کشادہ دل اور ہمدرد کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اگر ذہن ہمدردیوں سے بھرا ہو تو پھر وہ مقابلہ کس طرح کرے گا؟ مقابلے والا ذہن تو سخت' پرتشدد اور غیر ہمدرد ہوتا ہے۔ وہ بھی ویسا ہی ہوگا ہمارا سسٹم کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ایک ایسا شخص جو خود کو آگے دھکا دے رہا ہو وہ ایک پرتشدد انسان کی طرح دوسروں کو پیچھے کی جانب ڈھکیل رہا ہوتا ہے۔ وہ پرتشدد ہوتا ہے اور ہم اس کے تشدد کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اس طرح تعلیم کی فیکٹریاں بڑھتی رہتی ہیں' اسی کو ہم اسکولوں اور یونیورسٹی کا نام دیتے ہیں یہ قطعی جھوٹ اور فریب ہے۔

جہاں ایسی فیکٹریاں ہوں گی وہاں بیمار ذہن ہی پیدا ہوں گے اور وہی بیمار ذہن دنیا کو ایک کھائی میں دھکیل رہے ہیں۔ تشدد میں اضافے کے ساتھ ساتھ مقابلہ بھی بڑھ رہا ہے' ہر شخص کا ہاتھ' ہر شخص کے نرخرے پر ہے۔

وہ لوگ جو میرے قریب بیٹھے ہوئے ہیں' مجھ سے پوچھیں گے ہم لوگوں نے کس کا نرخرا دبا رکھا ہے؟ لیکن اگر آپ بغور جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر ایک شخص کا ہاتھ کسی نہ کسی دوسرے شخص کی گردن پر ہے اور دوسرے کا ہاتھ تیسرے کی جیب میں۔ یہ کب تک چلے گا؟

کہاں جا کر رکے گا؟ یہ ہائیڈروجن بم اور ایٹم بم کہاں سے آ رہے ہیں؟ مقابلے اور مسابقت سے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ مقابلہ اور رقابت دو اشخاص کے درمیان ہے یا پھر دو قوموں کے درمیان۔ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کون کر رہا ہے' چاہے وہ روس ہو یا امریکہ بس مقابلہ ہے اور ایک کو آگے نکلنا ہے۔

اگر تم ایٹم بم بناتے ہو تو ہمیں ہائیڈروجن بم بننا چاہیے ایک سپر ہائیڈروجن بم۔ ہمیں پیچھے نہیں رہنا چاہیے' ہمیں پیچھے رہ جانے کی تعلیم ہی نہیں دی گئی اگر تم دس افراد کو قتل کرتے ہو تو ہم بیس کریں گے' اگر تم ایک ملک کو تباہ کرتے ہو تو ہم دو ممالک کو تباہ کریں گے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم سب کچھ تباہ کر دینے کے لیے تیار ہیں لیکن پیچھے نہیں رہ سکتے۔

ایسی صورت حال کون پیدا کر رہا ہے؟ یہ سب کچھ ہماری تعلیم کا شاخسانہ ہے۔ ہم آنکھوں سے اندھے ہیں' مسئلے کو دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ بچوں کو ہم یقیناً یہی پڑھا رہے ہیں کہ نہ لالچ کرو نہ خوف کھاؤ لیکن ان کے ساتھ حقیقتاً کیا کر رہے ہیں؟ ہم انہیں پڑھا رہے ہیں کہ لالچ کرو اور ہر گھڑی ڈرتے رہو۔

پہلے زمانے میں جہنم کا خوف ہوا کرتا تھا یا انعام کے طور پر جنت ملنے کی امید۔ ہزاروں برسوں تک یہی پڑھایا گیا' ہمارے دلوں میں خوف تھا کہ ہم دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے لیکن کسی قدر یہ امید کہ شاید جنت مل ہی جائے۔ جہاں سزا اور جزا ہوگی وہاں لالچ اور خوف بھی ہوگا لیکن ہم اپنے بچوں کو کیا تعلیم دیتے ہیں؟ ہمارے پڑھانے کا کیا طریقہ کار ہے؟ طریقہ کار یہ ہے کہ لالچ اور خوف کو بڑھایا جائے یا تو ہم انہیں سزا دیتے ہیں یا پھر نقرئی تمغہ عنایت کرتے ہیں ایک اچھی شہرت' ایک اچھا عہدہ یا پھر سوسائٹی میں اعلیٰ مقام۔

اس زمانے میں جب میں طالب علم تھا تو کہا جاتا تھا کہ اگر تم اچھی طرح پڑھو گے تو نواب بن جاؤ گے' ایک حاکم یا صدر۔ ہم بچوں کے ذہنوں کو اس قسم کی ترغیبات سے بھر دیتے ہیں' کیا ہم انہیں کبھی یہ بھی پڑھاتے ہیں کہ پرامن خوشیوں بھری زندگی گزاریں؟ نہیں ہم نے انہیں یہ پڑھایا ہے کہ ترقی یافتہ زندگی گزاریں اور اونچا عہدہ حاصل کرنے کے لیے کوشش کریں۔ ہم نے انہیں یہ پڑھایا کہ زیادہ سے زیادہ دولت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے اور بہتر ضروریات زندگی کیسے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ہم نے انہیں پڑھایا کہ زیادہ سے زیادہ حریص

کیسے بنتے ہیں کیونکہ اسے کامیابی کا نام دیا جاتا ہے' کیا دنیا میں ناکام لوگوں کے لیے بھی کوئی جگہ موجود ہے؟

تعلیم کے اس موجودہ سسٹم میں ناکام لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہم تو بس کامیابیوں کا بخار چڑھانے میں لگے ہوئے ہیں چنانچہ ان لوگوں کے لیے جو کامیاب ہونا چاہتے ہیں' یہ فطرت بن جاتی ہے کہ دنیا میں وہ کچھ کرتے پھریں جو وہ چاہتے ہیں۔ کامیابی ان کے تمام غلط عمل پر پردہ ڈال دیتی ہے جب ایک چپراسی ترقی کرتے ہوئے صدر مملکت بن جاتا ہے تو یہ سوال حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے کہ وہ صدر کیسے بن گیا۔ کوئی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ وہ صدر کیسے بن گیا۔ آخر کس طرح اس نے کون سی دھوکہ بازی کی' کون سا فریب کیا یا کون سی چال چلی۔ اس بات کو پوچھنے کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ صدر مملکت کیسے بن گیا۔ نہ تو کوئی پوچھے گا اور نہ پوچھنے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے جب ایک شخص کامیاب ہو جاتا ہے تو سارے گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔ صرف کامیابی ہی منزل مقصود ہوتی ہے تو پھر میں کیوں نہ کامیاب ہونے کی جدوجہد کروں چاہے مجھے جھوٹ بولنا پڑے یا بے ایمانی کرنا پڑے؟ اگر میں سچ بولنے کی کوشش کروں اور ناکام ہو جاؤں تو پھر میں کیا کرسکتا ہوں؟

مطلب یہ ہوا کہ زندگی کا مرکز کامیابی ہے اور جب جھوٹ اور فریب بڑھے گا تو ہم خوشیوں سے بہت دور ہوں گے جب تک کامیابی ہی معیار رہے گا تو جھوٹ' فریب اور چوریاں تو ہوں گی۔ انہیں ختم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کیا کہا جاسکتا ہے اگر ایک شخص کامیابی حاصل کرنے کے لیے بے ایمانی اور چوری کا اہل ہے؟ جب کامیابی اصل معراج قرار پا جائے تو ہر دوسری چیز اس کی معاون ہوتی ہے۔ ہم چیختے چلاتے رہتے ہیں کہ بے ایمانی اور فریب بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ تو بڑھے گا کیونکہ وہ اس تعلیم کا پھل یا حاصل ہے جو ہم پانچ ہزار برسوں سے پڑھا رہے ہیں۔

کامیابی کی کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں۔ کامیابی عزت اور عظمت کا ذریعہ نہیں' ایک آدمی باصلاحیت ہوتے ہوئے بھی ناکام ہوسکتا ہے یہ اچھی بات ہے کہ ایک شخص اچھے مقصد کے لیے ناکام ہو جائے بجائے برے کام کے لیے کامیابی حاصل کرنے کے' عزت اچھے کام کو ملنی چاہیے کامیابی کو نہیں لیکن کامیابی معیار بن چکی ہے اور پوری زندگی اسی مرکز کے گرد چکر لگا رہی

ہے۔

ابھی جلد ہی ایک ایجوکیشن کمیشن قائم کیا گیا ہے اس کے چیئر مین نے کہا۔ ''ہم اپنے بچوں کو سچ بولنے کی تعلیم دیتے ہیں' ہم انہیں مختلف طریقوں سے سمجھاتے ہیں لیکن وہ جھوٹ بولے جا رہے ہیں۔''

میں نے چیئر مین صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ اپنے بیٹے کو سڑک کی صفائی کرنے والا یا اسکول کا چپراسی بنانا پسند فرمائیں گے' یا پھر یہ چاہیں گے کہ آپ کا بیٹا بھی کسی کمیشن کا چیئر مین بنے یا کسی ملک کا سفیر بنے اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے بلند ترین عہدے پر فائز ہو جائے؟ اگر وہ سڑک کی صفائی کرنے والا بن جاتا ہے تو کیا آپ کو تکلیف نہ ہوگی اور آپ مضطرب نہ ہو جائیں گے؟

انہوں نے جواب دیا ''ایسی صورت میں میں یقیناً مضطرب ہو جاؤں گا۔''

پھر میں نے کہا ''اس سے اگر آپ کو تکلیف پہنچے گی تو کیا آپ واقعی یہ پسند کریں گے کہ آپ کا بیٹا راست گو اور ایمان دار ہو؟''

جب تک ایک چپراسی کو عزت نہیں دی جاتی اور جب تک صدر مملکت کو عزت کا نشان سمجھا جاتا ہے' اس وقت تک دنیا میں ایمانداری' نیکی اور سچائی نہیں آسکتی کیونکہ ایک چپراسی ہمیشہ چپراسی رہنا پسند نہیں کرے گا۔ زندگی اتنی طویل نہیں ہوتی کہ وہ کامیابی کی امید میں آرام سے سچ کی چھتری کے نیچے بیٹھا رہے جب کہ جھوٹ اور کذب بیانی سے کامیابیوں تک پہنچا جاسکتا ہو۔ وہ پاگل ہی ہوگا جو دروغ کا راستہ نہ اختیار کرے۔ پوری صورت حال ایسی ہے کہ نہ صرف آپ بلکہ آپ کا تعمیر کردہ دیوتا اور آپ کی بنائی ہوئی جنت' سب ہی صرف کامیاب لوگوں کی عزت کرتے ہیں اگر ایک چپراسی مرتا ہے تو وہ امکانی طور پر جہنم کے لیے موزوں ہے' کوئی صدر جہنم میں کبھی نہیں جاتا وہ جنت مکانی ہو جاتا ہے۔

ہمیں کامیابی کے مرکز کو تباہ کرنا ہے اگر آپ اپنے بچوں سے سچ مچ محبت کرتے ہیں ان کے ساتھ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس کامرانی کے مرکز کو تبدیل کر کے صلاحیت کو مرکزیت دینی ہوگی۔ اگر آپ انسان دوستی پر یقین رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایک نئی دنیا' ایک نیا معاشرہ اور نیا آدمی پیدا کریں تو آپ کو اس پرانے احمقانہ قلعے کو مسمار کرنا ہوگا اور سوچیے کہ اسی میں سے

ایک انقلابی راستہ کیونکر نکالا جائے اس وقت ہر چیز بر خود غلط ہے اسی لیے غلط لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔

اس دنیا میں سب سے بڑا باغی اور سرکش' بنیادی طور پر ایک ٹیچر ایک استاد ہو سکتا ہے اور اسی طرح وہ نئی نسل کی رہنمائی کر سکتا ہے لیکن ٹیچر ایک بہت بڑا روایت پسند بھی ہوتا ہے چنانچہ اسی پرانی روش پر چلتا رہتا ہے استاد میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ کیا آپ نے کبھی سنا کہ کسی استاد نے بغاوت کی ہے؟ وہ تغیر اور تبدل سے محترز اور روایتی قسم کا انسان ہوتا ہے چنانچہ بہت خطرناک ہوتا ہے معاشرے کو اس سے کبھی صحت مندی نہیں ملی۔

ہم اساتذہ سے کس قسم کی بغاوت کی توقع کرتے ہیں؟ کیا اسے گھروں کو آتش برد کر دینا چاہیے' ٹرین کو پٹری سے اتار دیں یا گھروں کو آگ لگا دیں؟ نہیں وہ مجھے غلط نہ سمجھیں میں صرف یہ کہتا ہوں کہ انہیں اپنی قدر پہچانی چاہیے۔ اپنی حیثیت کو جاننا چاہیے' ان میں موجودہ تعلیم سے بغاوت کا جذبہ ہونا چاہیے انہیں سوچنا چاہیے کہ کیا غلطی یا کوتاہی ہو رہی ہے۔

جب ہم کسی بچے سے کہتے ہیں کہ وہ گدھا' بے وقوف یا احمق ہے اس لیے کہ کوئی دوسرا اس سے کافی آگے ہے تو سوچئے کہ کیا آپ کا کہنا صحیح ہے' کیا اس دنیا میں دو اشخاص برابر ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ بچہ جسے آپ گدھا کہہ رہے ہیں اس بچے جیسا ہو سکتا ہے جو اس سے بہت آگے؟ ہر شخص ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ ہے اس لیے موازنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ایک دوسرے سے موازنہ اور مقابلہ نہیں ہونا چاہیے۔

ایک چھوٹا پتھر چھوٹا ہوتا ہے اور بڑا پتھر بڑا' ایک چھوٹا درخت ہوتا ہے ایک بڑا درخت۔ گھاس کی پتی' گھاس کی پتی ہوتی ہے اور گلاب کا پھول' گلاب کا پھول ہوتا ہے۔ گھاس کی پتی سے برہم اور گلاب کے پھول سے خورسند نہیں ہونا چاہیے۔ گھاس کی پتی کو جیسی زندگی ملی ہے ویسی ہی گلاب کے پھول کو۔ کیا آپ انسانی ذہن کو گھاس کی پتی اور گلاب کے پھول کے درمیان رکھ کر دیکھ سکتے ہیں کہ کون بڑا اور کون چھوٹا ہے؟ کوئی چیز نہ بڑی ہے اور نہ چھوٹی' کیا گھاس کی پتی دیار کے پیڑ سے نیچی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو خدا نے گھاس کی پتی کو تباہ کر دیا ہوتا' اس طرح صرف دیار کا پیڑ ہی دنیا میں رہ جاتا لیکن انسان کی مقرر کی ہوئی قیمت یا معیار غلط ہے۔

میں اس بارے میں کچھ مزید باتیں کہنا چاہتا ہوں' پہلی بات تو یہ کہ یاد رکھیں جب تک ہم ایک شخص کا موازنہ دوسرے شخص سے کرتے رہیں گے اس وقت تک ہم غلط راستے پر رہیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم انسان میں ایسی خواہش پیدا کر رہے ہیں کہ وہ کسی دوسرے جیسا بنے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص نہ تو دوسروں جیسا ہے اور نہ دوسرے شخص جیسا بن سکتا ہے۔

راما بہت سال پہلے مر گیا' حضرت عیسیٰؑ کو بھی بہت عرصہ گزرا' پھر کوئی دوسرا عیسیٰؑ کیوں نہ پیدا ہوا حالانکہ ہزاروں عیسائی چوبیس گھنٹے اس مرتبے تک پہنچنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں؟ اسی طرح ہزاروں راما بننے کی تک و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ اُدھر ہزاروں جین اور ہزاروں بدھ مذہب کے لوگ مہاویرا یا بدھا بننے کی سعی بسیار کر رہے ہیں لیکن کوئی بھی ان جیسا نہ بن سکا؟ کیا یہ باتیں آپ کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟ میں رسیلہ والے راما کی بات نہیں کر رہا ہوں برائے کرم یہ نہ سمجھیں کہ میں اس راما کی بات کر رہا ہوں جو ڈرامے کے ایک کردار نے پیش کیا ہے' کچھ لوگ بے لباس ہو کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ مہاویرا ہیں۔ میں اس قسم کے راما اور مہاویرا کے متعلق کوئی بات نہیں کر رہا ہوں۔

کیا آپ نے اپنی پوری زندگی میں کوئی دو اشخاص ایسے دیکھے ہیں جو ایک جیسے ہوں؟ یہاں تک کہ پوری دنیا میں کوئی ایک شخص بھی دوسرے کے برابر نہیں ہے' دنیا کی ہر چیز بے مثل' بے نظیر اور یکتا ہے۔ ہم جب تک ہر شخص کی یکتائی اور بے مثالی کو عزت و احترام نہیں دیں گے اس وقت تک دشمنی' مقابلہ' قتل اور تشدد وغیر جاری و ساری رہے گا۔ جب تک کہ ہر ایک شخص بے ایمانی سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا رہے گا اور چاہتا رہے گا کہ وہ بھی کسی دوسرے جیسا بن جائے ایسی صورت میں ہمیں کس قسم کے نتائج برآمد ہونے کی توقع کرنی چاہیے؟

کیا کسی باغ کے پھول لٹو بن سکتے ہیں؟ عظیم اساتذہ جا کر یہ نہیں بتاتے کہ گل یاسمین کو چمپا جیسا اور چمپا کو یاسمین جیسا ہونا چاہیے کہ وہ بہت خوب صورت ہیں' کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ نہیں' نہیں کیونکہ پھول انسانوں کی طرح دیوانے نہیں ہیں۔ پھول اتنے بے وقوف نہیں ہوتے کہ وہ آدمیوں کی طرح سوچنے لگیں۔ پھول اساتذہ' فلاسفرز اور نام نہاد مذہبوں جیسے نہیں ہوتے۔

اگر پھول اس قسم کی باتیں سنیں تو باغ کا کیا حال ہوگا جہاں گل یاسمین چمپا بننے کی کوشش کررہے ہوں؟ اس باغ میں پھول پیدا ہونا بند ہوجائے گا۔ چاہے کوشش کرلے وہ کامیاب نہیں ہوسکتا' اس کی فطرت ایسی نہیں ہے چمپا بننے کی اس کی کوششیں اُسے یاسمین بھی نہیں رہنے دیں گی۔

یہ انسان کی بہت بڑی بدقسمتی ہے' بہت بڑی بدقسمتی یا بددعا کہ اس کی خواہش کسی اور جیسا ہونے کی ہوتی ہے' اسے پڑھاتا کون ہے؟ یہ سازش کس کی ہے؟ یہ ہزاروں سال پرانا ہمارا تعلیمی نظام ہے اور وہی اس کا ذمہ دار ہے اب اگر راما اور بدھا کے خاکے بے چمک ہوجائیں تو استاد چاہے گا کہ تم گاندھی یا VINOBA BHAVE جیسے بنو۔ کسی دوسرے جیسا بننا لیکن خود اپنے جیسا بننے کی غلطی نہ کرنا کیونکہ تم تو بے کار محض ہو۔ یہ گاندھی تھا جو کسی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا کیا یہ خدا کی غلطی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا؟ اگر کچھ زیادہ عقل مند ہوتا تو اس نے دس یا پندرہ لوگ ایسے پیدا کیے ہوتے جو راما اور بدھا جیسے ہوتے یا اگر تھوڑا مزید عقل مند جیسا کہ بیشتر مذہبی لوگ ہیں۔ تو وہ تمام لوگوں کے لیے کم از کم ایک تو ان جیسا پیدا کردیتا' ایسی صورت میں کیا ہوتا؟

ذرا اس دنیا کے متعلق سوچیں جہاں راما جیسے پانچ ارب لوگ موجود ہوتے' ایسی دنیا کا بنتا کیا؟ پوری دنیا پندرہ منٹ کے اندر خودکشی کرلیتی۔ دنیا شدید بوریت کا شکار ہوتی کہ ہر چہار جانب اسے راما ہی راما نظر آتے اگر ہر پودا صرف گلاب کا پھول پیدا کرنے لگے تو کیا ہوگا؟ لوگوں سے گلاب کا پھول نہیں دیکھا جائے گا یا یوں سمجھیں کہ اس کی کوئی قدرو قیمت نہیں رہے گی لوگ اس پر نظر تک نہیں ڈالیں گے۔

انسان کی قدرو قیمت اس لیے ہے کہ ہر ایک شخص اپنی ذاتی شخصیت کا حامل ہے' فخر کی بات یہ ہے کہ ہر ایک شخص دوسرے سے قطعی مختلف ہے اچھا اور برا' اونچا اور نیچا کوئی چیز نہیں' ہر ایک شخص بس ہے۔ ہر شخص کا اپنا مقام ہے' اس لیے ہر قسم کی درجہ بندی غلط ہے لیکن ہم لوگ وہی غلط باتیں پڑھا رہے ہیں۔

میں جب بغاوت اور سرکشی کی بات کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں سوچنا چاہیے اور بغور دیکھنا چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دے رہے ہیں' کیا ہم ان کے

ذہنوں میں زہر نہیں بھر رہے ہیں؟ زہر تو محبتی انداز میں بھی دیا جاتا ہے۔ استاد اور والدین وہی کررہے ہیں اب وہ ختم ہوجانا چاہیے۔

دنیا میں مذہبی انقلابات بھی رونما ہوئے ہیں' ایک مذہب کے لوگوں نے دوسرا مذہب اختیار کیا ہے' کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگوں نے کسی کے مشورے پر اپنا مذہب بدل دیا اور کبھی اس وقت تبدیل کیا جب ان کے سینے پر تلوار رکھ دی گئی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر کوئی ہندو مسلمان ہوجائے یا کوئی مسلمان عیسائی ہوجائے تو بھی وہ بہرحال وہی آدمی کا آدمی رہتا ہے' مذہبی انقلاب سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

سیاسی انقلابات بھی برپا ہوتے رہے ہیں ایک شخص کی حکومت ختم کرکے دوسرے نے قبضہ جمالیا۔ وہ شخص جس کے قبضے میں ایک قطعہ اراضی تھا اس کے پڑوسی نے اس زمین پر قبضہ کرلیا۔ وہ جو سفید جلد کا مالک تھا اسے ہٹا دیا گیا اور ایک کالی جلد والے نے اس کی زمین پر قبضہ کرلیا لیکن اندر کا حکمران وہی رہا۔

اس دنیا میں معاشی انقلابات آتے رہے ہیں' سرمایہ دارانہ نظام حکومت کو ختم کرکے ان کی جگہ مزدوروں نے لے لی لیکن اس جگہ پر قبضہ کی صورت میں مزدور خود سرمایہ دار بن گئے؟ نہیں' سرمایہ دارانہ نظام گیا اور اس کے اندر ماہر پیشہ وروں نے سنبھال لی۔ یہ بھی اتنے ہی خطرناک ثابت ہوئے جیسے کہ سرمایہ دار تھے۔ کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی' انسانوں کی درجہ بندی اسی طرح رہی۔ ابتدا میں صرف دو کلاسز ہوا کرتی تھیں غریب اور امیر۔ اب ایک کلاس ایسے لوگوں کی ہے جو پیسے بانٹتے ہیں اور دوسری کلاس ایسی ہے جو پیسے وصول کرتی ہے جس کے پاس زیادہ طاقت ہوتی ہے وہی اقتدار میں رہتا ہے۔ کمزور لوگوں کو کبھی اقتدار نہیں ملتا' نئی درجہ بندیاں تو کی گئیں لیکن درجے اسی طرح برقرار رہے۔

گزشتہ پانچ ہزار برسوں میں انسانیت کی فلاح و بہبود کے جتنے تجربات کیے گئے سب نے ناکامی کا منہ دیکھا آج تک ایک تجربہ نہیں کیا گیا اور وہ تجربہ ہے تعلیمی انقلاب۔

یہ تجربہ استادوں کو کرنا چاہئے میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس بڑے انقلاب کو برپا کرسکتے ہیں۔ سیاسی' معاشی یا مذہبی انقلابات کی کوئی خاص اہمیت نہیں جیسی کہ تعلیمی انقلاب کی ہوسکتی ہے لیکن یہ انقلاب کون لاسکتا ہے؟ یہ وہی شخص لاسکتا ہے جو سوچے اور خود سے سوال کرے کہ وہ اب تک

کیا کرتا رہا ہے۔

ان کے ذہن میں ایک بات صاف ہونی چاہیے کہ انہوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ غلط ہے کیوں کہ اس عمل کے نتائج غلط ہیں۔ ہمیں سوچنا ہے کہ موجودہ شخص کہاں سے آیا ہے؟ موجودہ معاشرہ کس طرح معرض وجود میں آیا؟ ساری جنگیں' سارا تشدد جو جاری ہے' یہ تکالیف' یہ ذہنی عذاب' بیچارگی اور غربت جو پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے' وہ کہاں سے آئی چلی جا رہی ہے؟ یقیناً نظام تعلیم میں کوئی نہ کوئی ایسی خرابی ضروری ہے جو ہم فراہم کر رہے ہیں چنانچہ سوچئے اور بیدار ہوئیے لیکن آپ کسی اور حساب کتاب میں مصروف ہوں گے...... ٹیچرز نے کانفرنس منعقد کی اور شکوہ کیا کہ طلباء میں نظم وضبط کا فقدان ہے اور سوچا کہ طلباء کو نظم وضبط کا پابند کیسے کیا جائے' سکون سے سوچتے رہئے طلباء کو اسی طرح نظم وضبط سے عاری رہنے دیں کیونکہ ہمیں پانچ ہزار سال سے نافذ نظم وضبط کا حشر معلوم ہے۔ طلباء تو ہزاروں برس سے نظم وضبط کے سائے تلے موجود رہے ہیں لیکن ہوا کیا؟

نظم وضبط سکھانے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ استاد جو کچھ کہے وہ اسے صحیح سمجھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر استاد نیچے بیٹھتا ہے تو طلباء بھی زمین پر بیٹھ جائیں' اسے ہاتھ جوڑ کر پرنام کہیں اور بہتر ہوگا کہ اس کے پیر چھو لیں لیکن اساتذہ کیا کہتے ہیں اس جانب چلو جدھر کہا جاتا ہے اگر وہ تم سے بیٹھنے کے لیے کہے تو بیٹھ جاؤ۔ اگر وہ تم سے کہتا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جاؤ' اب تک نظم وضبط کی یہی قسم رہی ہے لیکن یہ ایک سازش ہے' انسان کو قتل کر دینے کی سازش تا کہ ان میں شعور نہ پیدا ہو سکے' آگاہی نہ آنے پائے اور انسان میں دانائی ودانش نہ باقی بچے۔

وہ لوگ فوجی تربیت کے دوران کیا کریں گے؟ وہ ان کا انتخاب کریں گے اور تین چار سال تک مشقت کرائیں گے بے وقوفی پر مبنی باتیں پڑھائی جائیں گی' دائیں اور بائیں گھماتے ہوئے (لفٹ ٹرن' رائٹ ٹرن) سب کچھ حکم کے مطابق کرتے رہیں گے تا کہ ان کی ذہانت تباہ ہو جائے۔ جب ایک شخص سے کہا جائے کہ دائیں گھومو یا بائیں گھومو تو کیا نتائج برآمد ہوں گے؟ اس کا دماغ اثرات سے کب تک بچا رہے گا؟ اگر اس نے دائیں یا بائیں گھومنے سے انکار کیا تو سزا پائے گا' چند ہی دنوں میں اس کی ذہانت تباہ ہو کر رہ جائے گی اور اس کی انسانی

خصوصیات بھی ختم ہو جائیں گی اگر اس سے کہا جائے لفٹ ٹرن تو مشین کی طرح گھوم جائے گا اگر اس سے کہا جائے کہ کسی کو قتل کر دو تو وہ کر دے گا۔ وہ آدمی نہیں رہ جائے گا بلکہ ایک مشین بن جائے گا۔ کیا نظم وضبط اسی کو کہتے ہیں؟ اور ہماری خواہش ہے کہ اسی قسم کا نظم وضبط بچوں میں بھی ہو۔ ہم اسی لیے بچوں کو کیڈٹ ٹریننگ دیتے ہیں ان سے کہتے ہیں کہ سپاہی بن جاؤ' انہیں سکھاتے ہیں بندوق کس طرح پکڑی جاتی ہے اور قتل کس طرح کیا جاتا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ پانچ ہزار برسوں میں انسان یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ نظم وضبط کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اس طرح ختم ہو کر رہ جائے' ایک شخص جتنا زیادہ نظم وضبط کا پابند ہے اتنا ہی زیادہ مردہ ہے۔

اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ میں طلباء سے یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ بغاوت کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں اور اسکول میں جنگ شروع کر دیں یا وہ دوسرے طلباء کو پڑھنے سے روک دیں؟ نہیں میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ آپ بچوں سے محبت کریں۔ ان کے متعلق غور وفکر کریں اور ان کی بہتری اور بہبود کا سامان پیدا کریں' اس محبت اور بہتری کی خواہش کے ساتھ وہ نظم وضبط جو نافذ نہیں ہوا' پیدا ہونا شروع ہو جائے گا وہ نظم وضبط جو بچوں میں ذہانت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ بچے سے محبت کر کے دیکھیں کیا اس سے انہیں نظم وضبط پیدا نہیں ہوتا۔ یہ نظم وضبط ویسا نہیں ہوگا جو لفٹ ٹرن اور رائٹ ٹرن سے آتا ہے۔ یہ ذہن کے اندر سے پیدا ہوتا ہے' بچے کے دل اور روح سے۔ اس کی ذہانت اور سوچ کو بیدار کرنے کی کوشش کریں۔

یہ نہ کہیں کہ سچائی صرف وہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں' کیا آپ جانتے ہیں کہ سچائی کیا ہوتی ہے لیکن ہر شخص یہی کہتا ہے کہ وہ جو کہہ رہا ہے وہی سچائی ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ تیس سال پہلے پیدا ہوئے ہیں صرف اس لیے کہ دوسرا شخص آپ سے تیس برس بعد پیدا ہوا ہے' کیا آپ اس سے زیادہ سچائی جانتے ہیں؟ یہ ممکن ہے کہ اس نے آپ کے مقابلے میں علم کو کم حاصل کیا ہو جبکہ آپ نے بہت سی غلط باتیں اپنے ذہن میں جمع کر رکھی ہیں لیکن آپ سمجھتے ہیں آپ بڑے عقل مند ہیں کیونکہ تیس برس بڑے ہیں' آپ کے پاس سزا دینے کی طاقت ہے چنانچہ آپ اس سے نظم وضبط چاہتے ہیں۔

اگر کوئی دوسرے کو نظم ضبط نہ سکھائے تو دنیا زیادہ بہتر ہوگی۔ محبت صرف محبت ہی آپ کی رہنمائی کر سکتی ہے، محبت بھری زندگی گزاریں۔ بچوں کے متعلق ہمیشہ اچھائی کی باتیں سوچیں اور یہ کہ آپ ان کی بہتری کے بارے میں کیا کر سکتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں، یہ چیز ناممکن ہے کہ آپ کی محبت اور آپ کے دل میں ان کی بہتری کی خواہش انہیں نظم وضبط کا پابند نہ کرے، ساتھ ساتھ آپ کی عزت وتوقیر میں بھی اضافہ ہوگا۔

بہر حال اس میں ایک نکتہ بھی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ جو بچہ جتنا حساس اور ہوشمند ہوگا وہ نظم وضبط سے اتنا ہی عاری ہوگا اور جو بچہ جتنا زیادہ احمق ہوگا وہ نظم وضبط کا اتنا ہی پابند ہوگا۔ میں جو بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ محبت کے ذریعے پیدا ہونے والے نظم وضبط کا احمق بچوں میں فقدان ہوگا لیکن حساس اور ہوشیار بچوں میں نظم وضبط زیادہ پیدا ہوگا ابھی تو صرف ایسے بچے جن میں نہ زندگی ہے اور نہ ہی کوئی اصول پسندی وہی نظم وضبط کے پابند ہوتے ہیں اور جو بچے حساسیت رکھتے ہیں اور ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ نظم وضبط سے عاری ہوتے ہیں اور جب محبت ہوگی تو چیزیں مختلف ہوں گی۔ احمقوں کے نظم وضبط کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے کیونکہ حساس نظم وضبط کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ سوچ اور شعور کے ذریعے آتی ہے اور وہ غلط قسم کی باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

اگر ہندوستان اور پاکستان کے نوجوانوں میں ان کے اپنے احساس کے ذریعے نظم وضبط پیدا ہوا ہے تو ممکن ہے کہ ان سے پاکستانی حکومت یہ کہے کہ جاؤ اور ہندوستانیوں کو قتل کر دو؟ یا ہندوستانی حکومت اپنے نوجوانوں سے کہے کہ جاؤ اور پاکستانیوں کو قتل کر دو؟ وہ فوراً اپنے سیاستدانوں سے کہیں گے کہ اس قسم کی بے وقوفی کی باتیں مت کرو، وہ کہیں گے یہ خیال ذہنیت سے بعید ہے اور میں یہ نہیں کر سکتا۔ لیکن فی الوقت احمقوں کو نظم وضبط سکھایا اور پڑھایا جاتا ہے چنانچہ اگر اسے قتل کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ فوراً عمل پیرا ہو جائیں گے کیونکہ ان کے لیے نظم وضبط ہی سچائی ہے۔

سیاستداں اور مذہبی رہنماؤں نے اس دنیا میں نظم وضبط کی تبلیغ کی ہے کیوں کہ ان با اختیار لوگوں میں ذہانت کا فقدان ہے۔ ان میں باغیانہ سوچ اور فکر کی طاقت ہوتی ہی نہیں، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ پوری دنیا کو ایک ملٹری کیمپ میں تبدیل کر دیں، وہ ہر طریقے سے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی کہیں کسی قسم کا مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن بہت سارے اختراعی طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ روس میں ایسی مشینیں ہیں اگر کسی کے دماغ میں باغیانہ جراثیم ہوں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہو تو وہ فوراً ہی برین واش کے ذریعے اسے نکال باہر کرتے ہیں کیونکہ باغی اور سرکش ذہن بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ وہ حکومت کے خلاف بات کرتے ہوئے لوگوں کو غلط کام کرنے سے روک سکتا ہے، پہلے نظم وضبط کے مختلف طریقے ہوا کرتے تھے لیکن وہ مکمل طور پر پُر اثر نہیں تھے اب ان کے ہاتھ ایک نیا طریقہ لگ گیا ہے اور وہ جس پر شبہ ہو اس کا دماغ ٹھیک کر دیتے ہیں۔ یہ روش انتہائی خطرناک ہے، پوری دنیا کے لیے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سے بھی زیادہ خطرناک۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اساتذہ اس بارے میں تعاون کریں گے؟ میں اس سوال کو آپ کی بحث کے لیے چھوڑتا ہوں، کیا آپ دنیا کی صورت حال سے مطمئن ہیں؟ کیا آپ آج کل کے لوگوں سے مطمئن ہیں، کیا آپ جنگوں، تشدد اور بے ایمانیوں سے مطمئن ہیں؟ اگر نہیں تو سوچئے کہ تعلیم وتربیت میں کیا خامی ہے جو ہم اپنے بچوں کو دے رہے ہیں۔ یہ بات واضح اور عیاں ہے کہ جو تعلیم بھی دی جا رہی ہے وہ غلط ہے۔

اگر ایک استاد باغی اور سرکش ہے اور اگر وہ سوچتا سمجھتا ہے اور سوجھ بوجھ رکھتا ہے اور سوسائٹی کے لیے فائدہ مند ہے تو وہ مستقبل کے لیے ایک اچھا معاشرہ قائم کرنے میں مددگار ہو سکتا ہے اگر اساتذہ ایسے نہیں ہیں تو وہ بچوں کے ذہنوں کو پرانے کاٹھ کباڑ سے بھرتے رہیں گے وہ یہ کام بہت دنوں سے کر رہے ہیں، اب ایک انقلاب بپا ہونا چاہیے ایک بڑا انقلاب، جس کے ذریعہ پرانا تعلیمی ڈھانچہ برباد ہو جائے اور ایک نیا ڈھانچہ جس میں نئی قدریں ہوں وہ رائج ہونا چاہیے اس نئے ڈھانچے میں کامیابی اور امتیاز کا مقام نہ ہو اور اول وآخر آنے پر نہ عزت و احترام دیا جائے اور نہ تذلیل کی جائے ایک شخص کا دوسرے شخص سے موازنہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ ایسی کوشش ہونی چاہیے کہ بچوں کو محبت کے ذریعے پروان چڑھایا جائے، یقیناً یہ بات ممکن ہے کہ دنیا کو ایک نئے اور حیرت انگیز جہان میں تبدیل کر دیا جائے جہاں خوشبو ہی خوشبو ہو۔

میں نے یہ چند باتیں آپ کو اس لیے بتائی ہیں کہ تا کہ چند لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا جائے لیکن بہت سے لوگ گہری نیند میں ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کی نیند میں خلل

پڑے۔ بہرحال اگر چند لوگ بھی اپنی آنکھیں کھول دیں تو شاید میری کہی ہوئی باتوں سے کچھ کام کی باتیں مل جائیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ میری معروضات صحیح اور برحق ہیں کیونکہ پرانے اساتذہ یہی دعویٰ کرتے ہیں' میں نے صرف اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے جو غلط بھی ہوسکتا ہے' ممکن ہے اس میں سچائی کی رمق تک نہ ہو اس لیے میں آپ پر زور نہیں دیتا کہ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے میری باتوں کو تسلیم کرلیں۔ صرف میری درخواست یہ ہے کہ ان باتوں پر غور ضرور کریں۔ سوچئے اگر میری کہی ہوئی باتوں میں کچھ سچائی ہوئی تو وہ میری نہیں بلکہ آپ کے غوروفکر کا نتیجہ ہوگی' آپ میرے پیروکار نہیں بن جائیں گے بلکہ یہ آپ کا شعور ہوگا چنانچہ وہ آپ کی اپنی بات ہوگی۔

برائے کرم چند باتوں پر غور کیجیے' ابھی دنیا کو بیدار کرنے کے لیے بہت سے جھٹکوں کی ضرورت ہے' یہی وجہ ہے جو یہ سوچ پیدا ہوئی ہے' ہم قریب قریب خوابِ غفلت میں ہیں ویسے جیسے مردہ ہوتا ہے اور سب کچھ ہوئے جارہا ہے۔ مجھے امید ہے آپ کو مختلف طریقوں سے بہت سارے جھٹکے لگے ہوں گے چنانچہ آپ اپنی آنکھیں کھولیے اور غوروفکر شروع کردیجیے۔

اساتذہ کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود کو سیاستدانوں سے محفوظ رکھیں اور صدور اور وزیراعظم سے بچائیں' دنیا میں جتنے بھی مسائل ہیں انہی کی وجہ سے ہیں۔ بچوں کے ذہنوں میں ان کو نہ اترنے دیں' سیاستدان سب سے پہلے بچوں کے ذہنوں میں کامیابی کی امنگ بھرتے ہیں اگر تم نمبرون ہوئے تو کہاں پہنچو گے؟ سیاست میں نمبرون ملیں گے' آپ اخبارات میں روزانہ ان کی تصاویر اور نام دیکھتے ہوں گے۔

بچوں میں مقابلے کا رجحان نہ پیدا ہونے دیں' زندگی میں محبت اور چاہت کو بڑھاوا دیں۔ مقابلہ اور رقابت نہ پیدا کریں کیونکہ جو شخص دوسروں سے لڑتا ہے وہ آہستہ آہستہ ختم ہوجاتا ہے اور جو زندگی میں رقابت کی بجائے اپنے اندر مگن رہتا ہے' وہ ایک پھول بن جاتا ہے' خوشبوؤں سے بھرا اور حسین پھول۔ خدا دانائی اور شعور حاصل کرنے میں تمہارا مددگار ہو تاکہ تمہارے اندر باغیانہ جذبہ پیدا ہوسکے۔

میں ممنون ہوں کہ آپ نے انتہائی سکون اور خاموشی سے میری معروضات سماعت کیں میں آپ کے اندر موجود تقدس کو سلام پیش کرتا ہوں' برائے کرم میری خیرسگالی کو قبول فرمائیے۔

نئے انسان کی پیدائش

آپ کے درمیان موجود ہونا میرے لیے انتہائی خوشی کا مقام ہے۔ یقیناً اس موقعے پر میں اپنے دل کی باتیں آپ سے کروں گا۔

موجودہ تعلیمی صورت حال دیکھنا بہت ہی تکلیف دہ عمل ہے۔ اس صورت میں ایک آزاد اور صحت مند انسان پیدا کرنا ناممکن ہے جہاں تعلیم کے نام پر ذہن میں ہر قسم کی غلامی بھری جارہی ہے۔ اس تعلیم میں گند اور اپاہج انسانیت کی جڑیں پوشیدہ ہیں۔ موجودہ تعلیم نے آدمی کو حقیقی فطری اوصاف سے نہ صرف الگ کردیا ہے بلکہ اس قابل بھی نہیں چھوڑا ہے کہ کسی معاشرے میں شائستہ، مہذب انداز و اطوار کو پیدا کیا جاسکے، اس کے برخلاف اس نے غیر فطری زندگی کو پیدا کردیا ہے۔ ہر نسل جاتے ہوئے اسی غیر فطری پن کو آنے والی نسل پر تھوپ کر چلی جاتی ہے اور جب اس غیر فطری معاشرے کی تطہیر کی بات ہوتی ہے تو وہی تھونپی ہوئی چیز تقدس کا روپ دھار لیتی ہے۔ جب کوئی گناہ تقدس کے پردے میں چلا جائے تو مزید تباہ کن بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ استحصال خدمت گزاری کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ تشدد، عدم تشدد کا لباس زیب تن کرلیتا ہے اور غیر فطری پن شائستگی کا جامہ پہن لیتی ہے۔ مذہبی عبادت گاہوں میں غیر مذہبیت کا ہونا بلاوجہ نہیں۔ غیر مذہبیت کبھی براہ راست عیاں انداز میں آیا کرتی تھی۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ صرف لباس اور سج دھج پر اعتبار نہ کیا جائے۔ اس کے برخلاف ضروری یہ ہے کہ چیزوں کو عریاں کرنے کے بعد اسے اس کی اصلی شکل میں دیکھا جائے۔

میں چاہوں گا کہ تعلیم کے مسائل پر نظر ڈالوں اور اسے منظرِ عام پر لے آؤں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اسے غلط انداز سے نہیں دیکھیں گے۔ میں مجبور ہوں، ایسا کرنا ضروری ہے۔ تعلیم کی حقیقی روح کو دیکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس پر پڑے نام نہاد پردے کو ہٹا کر دیکھا جائے کیونکہ اس انتہائی خوب صورت پردے کے پیچھے کوئی گھناؤنی اور غیر صحت مند روح موجود ہوگی ورنہ بنی نوع انسان میں اتنی نفرت، تشدد اور غیر مذہبیت نہ ہوتی۔

جب ہمیں زندگی کے پیڑ سے کڑوا، زہریلا پھل ملے تو کیا یہ یاد نہیں آتا کہ ہم نے کتنا غلط

بیج بویا تھا؟ اگر بیج اچھا اور صحیح ہوتا تو اتنے خراب پھل نہیں آسکتے تھے۔ علاوہ اس کے زہر بھرے پھل والا درخت اور کس چیز کی نشان دہی کرتا ہے؟ اگر لوگ غلط ہیں تو یقیناً صحیح تعلیم نہیں دی جارہی ہے۔

ممکن ہے کہ آپ کے خیالات، میرے خیالات سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اور آپ اسی طرح نہ سوچ رہے ہوں جیسے میں سوچ رہا ہوں، میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ مجھ سے متفق ہوں، میری تو صرف یہ درخواست ہے کہ آپ میری باتوں کو ضرور سن لیں۔ سچائی کو خاموشی سے سن لینا ہی بہت ہے اگر سچ ماننے پر اصرار کیا جائے تو وہ ناراستی اور کذب ہوگا۔ اگر سچ کو سن لیا جائے تو اس سچائی کے نتائج خود برآمد ہو جاتے ہیں۔

سچائی کو ٹھیک طرح سن لینا اس کی قبولیت کی دلیل ہے۔

میرا اندازِ نظر مختلف یا تعلیمی صحیفوں کے یکسر خلاف ہو۔ میں نہ تو ماہرِ تعلیم ہوں نہ ماہرِ عمرانیات۔ بہرحال یہ میری خوش نصیبی ہے کہ جو لوگ صحیفوں سے آگاہ ہوں ان کے لیے زندگی کو سمجھنا اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ صحیفے سچائی کو سمجھنے میں ہمیشہ رکاوٹ ہوتے ہیں۔ ایک ذہن میں جب صحیفے بھرے ہوں تو استغراق نہیں ہو پاتا۔ کیا گہری فکر یا استغراق کے لیے ہلکا پھلکا، صاف، غیر متعصب یا غیر جانبدار ذہن ضروری نہیں ہوتا؟ صحیفے اور اصول ایک سمت متعین کر دیتے ہیں۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ غیر جانبدار اور بے ضرر انداز میں زندگی اور زندگی کے مسائل کو دیکھا جائے۔

ایسے لوگ جن کے لیے صحیفے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، ان کے لیے مسائل سے زیادہ اس کا حل ضروری ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مسائل کو دیکھنے کی ابتدا حل کے سیاق وسباق سے شروع کرتے ہیں۔ اس کے بجائے کہ حل کو مسائل کے سیاق وسباق سے دیکھیں۔ اس سے ایک عجیب وغریب صورت حال جنم لیتی ہے اور مسئلہ بجائے حل ہونے کے اور الجھ جاتا ہے۔ بنی نوع انسان کی پوری تاریخ اس کی ذمہ دار ہے۔

انسان کی سوچ اور اس کے کام اتنے مختلف بلکہ متضاد کیوں ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ صحیفوں کی بنیاد پر قائم کیے ہوئے مسائل کے حل اور زندگی کے متعلق قائم کیے ہوئے اصول ہوتے ہیں۔ مسائل سے حل نہیں نکالے جاتے بلکہ مسائل مسلط کر دیے جاتے ہیں۔ حل باہر ہوتے

ہیں جبکہ مسائل اندر۔ حل قوتِ استدلال میں ہوتے ہیں جبکہ مسائل کا تعلق زندگی سے ہوتا ہے۔ یہ اندرونی تنازع بنیادی خرابی بن جاتا ہے۔

یہ جنون اور دیوانگی تہذیبوں میں جاری چلی آرہی ہے جو اب آتشگیز مادہ بن چکی ہے بنی نوع انسان کی پوری نسل اسی صلاحیتی دھماکے سے ڈری ہوئی ہے۔ آپ خوف زدہ رہتے ہوئے کیا حاصل کر سکتے ہیں؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ خوف زدہ نہ رہا جائے اور پوری صورت حال کو مدنظر رکھے ہوئے ہمت کے ساتھ معاملات کو سمجھا جائے۔

میں صحیفوں کو درمیان میں نہیں لاؤں گا کیونکہ یہ نہیں چاہتا کہ حل مجھے کور چشم کر دے۔ میں چاہوں گا کہ آپ کی توجہ حقائق پر مرکوز کروں جو صرف اسی وقت نظر آسکتے ہیں جب مسائل کو براہ راست دیکھا جائے۔ کیا زندگی کو براہ راست نہیں دیکھا جاسکتا؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم زندگی کو اسی طرح براہ راست دیکھیں جیسا کہ پہلے انسان نے دیکھا تھا؟ کیا ہمارا ذہن زندگی کو سادگی، قدرتی اور آزاد حیثیت سے نہیں دیکھ سکتا؟

اس کو میں تعلیم کی تباہی کا بہت بڑا بنیادی مسئلہ سمجھتا ہوں، اگر تعلیم انسانوں کے ذہن کو پرانے اور الجھاؤ سے بھرے بوجھ سے بھر دے تو یہ کسی بھی طرح اچھا نہیں ہوسکتا۔ ایسے پرانے بوجھ سے انسانی ذہن علم سے محروم رہتا ہے اور زندگی کی خوشیاں اور حسن نہیں حاصل کر پاتا۔ علم کے تجربات کے لیے زندگی کی خوشیوں اور حسن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسم کا بوڑھا ہونا یقینی ہوتا ہے جبکہ ذہن نہیں ہوا کرتا۔ ذہن ہمیشہ جوان رہتا ہے ذہن مرنے کے آخری لمحات تک جوان رہتا ہے اور صرف ایسا ہی ذہن زندگی اور موت کی پراسراریت کو سمجھ سکتا ہے اور صرف ایسا ہی ذہن مذہبی ذہن ہوسکتا ہے۔

جبکہ صورت حال یہ ہے کہ موجودہ تعلیم ذہن کو بوڑھا بنا رہی ہے۔ یہ ذہن کو بیدار کرنے کے بجائے اسے بھر دیتی ہے چنانچہ ذہن بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ذہن مختلف قسم کے خیالات بھرنے کے باعث بھی بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس پر بار ہوتا ہے اور وہ تھک جاتا ہے۔ خیالات کی چراگاہ ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یادداشت کو تقویت دینا۔ اس سے ذہانت اور غور وفکر کی روشنی نہیں پھوٹتی۔ یادداشت ذہانت نہیں ہوتی، یادداشت میکانیکی ہوتی ہے جبکہ ذہانت شعوری۔

آپ کو عقل منتقل نہیں کی جا سکتی ہاں اسے بیدار کیا جا سکتا ہے۔ جہاں سوچ بیدار ہو وہاں ذہن جوان و توانا ہوتا ہے' جہاں ذہن جوان ہے' زندگی مسلسل چیلنج ہے' جہاں شعور کا دروازہ کھلا ہو اور نسیم سحری داخل ہو رہی ہو' وہاں چڑھتے سورج کی روشنی بھی پہنچتی ہے اگر کسی کا ذہن دوسروں کے خیالات کا اسیر ہو تو سچائی کے آسمان میں اڑنے کی صلاحیتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

لیکن اس بارے میں تعلیم کیا کر سکتی ہے؟ کیا یہ اس بات کی تعلیم دیتی ہے کہ کیسے سوچیں یا پھر مردہ اور پرانے خیالات سے مطمئن ہو جاتی ہے؟ کسی شخص کو سوچ کی قوت کے علاوہ کیا چیز بہتر زندگی سے سرفراز کرتی ہے؟ لیکن جو چیز ایک شخص کو زندگی سے عاری کرتی ہے وہ دوسروں کے بے لچک خیالات ہوتے ہیں دوسروں کے خیالات کا اجتماع ایک شخص کو احمق بنا دیتا ہے جس ذہن میں دوسروں کے خیالات جمع ہو جائیں تو اس میں تفکر اور ذہانت پیدا نہیں ہوتی میکانیکی یادداشت پر بہت زیادہ زور دینے سے تفکر اور ذہانت کی پیدائش پر مہلک اثر پڑتا ہے۔ اگر اسے بڑھانا ہے تو یہ انتہائی ضروری ہے کہ غور و فکر اور ذہانت کو زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے ایمان وعقیدے کی جگہ اشتباہ کی تعلیم دی جانی چاہیے تا کہ غور و فکر اور ذہانت پیدا ہو سکے۔

ایمان و یقین اور خوش فہمی آپ کو باندھ دیتی ہے جبکہ اشتباہ آپ کو آزاد کر دیتا ہے ہاں یہ بھی سمجھ لیں کہ اشتباہ سے میرا مطلب بے اعتمادی نہیں ہے بے اعتمادی اعتماد کی ضد اور منفی سوچ ہوتی ہے۔ اس لیے اعتماد اور بے اعتمادی نہیں بلکہ اشتباہ ہونا چاہیے۔ اعتماد اور بے اعتمادی دونوں ہی اشتباہ کی موت ہیں اور جہاں آزادی کی شدت کے ساتھ اشتباہ نہ ہو وہاں نہ تو سچائی کی تلاش ہوتی ہے اور نہ وہ مل پاتی ہے۔

اشتباہ کی شدت تلاش بن جاتی ہے' اشتباہ پیاس ہے' اشتباہ تمنا' خواہش اور آرزو ہے۔ اشتباہ کی حرارت سے ہی سوچ پیدا ہوتی ہے' اشتباہ کی تکلیف دراصل سوچ کی پیدائش کی تکلیف ہے۔ وہ لوگ جو اس تکلیف سے بھاگتے ہیں وہ سوچ کی پیدائش کو روک دیتے ہیں۔

کیا ہم اشتباہ کرتے ہیں؟ کیا ہم زندگی کی بنیادی قدروں اور مفہوم کے متعلق بے یقینی میں مبتلا ہیں؟ اگر نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری تعلیم میں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہے۔ صحیح تعلیم کی بنیاد اشتباہ کے بغیر ممکن ہی نہین اگر بے یقینی نہیں ہوگی تو تلاش کس طرح ہو سکے گی؟ اگر بے یقینی نہیں ہوگی تو خلش کیونکر پیدا ہوگی؟ اگر بے یقینی نہیں ہوگی تو آپ کچھ کیسے جانیں گے

اور سچائی تک کس طرح پہنچیں گے؟ یہی وجہ ہے جو ہم سب لوگ آسودہ خاطر اور مطمئن ہیں اور ہماری ارواح وہ بہتا ہوا دریا نہیں بن پائیں جو مسلسل بہہ کر سمندر کو تلاش کرتا ہے۔ یہ سختی یا سخت گیری کس نے پیدا کی؟ اسے یقیناً ہماری تعلیم اور اساتذہ نے پیدا کیا' اساتذہ کے ذریعے انسانی ذہن کو زنجیر پہنا کر عیاری سے غلامی میں دھکیل دیا۔ یہ عیارانہ استحصال بہت پرانا ہے' اس استحصال کی بہت سے وجوہات ہیں۔ مذہب' مذہبی رہنما' حکومت' سوسائٹی کے مخصوص مفادات' امراء اور سیاستداں۔

سیاستدان کبھی نہیں چاہتے کہ لوگوں میں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو کیونکہ جہاں سوچ ہوگی وہاں بغاوت اور سرکشی کے بیج ہوں گے۔ سوچ بنیادی طور پر باغی ہوتی ہے کیونکہ سوچ اندھی نہیں ہوتی' اس کی اپنی آنکھیں ہوتی ہیں۔ سوچ کو اس طرح اور اس طرح بویا نہیں جا سکتا' یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ قبول کرو یا سب کچھ اپنی خواہش کے مطابق کرو' اسے اندھا مقلد بھی نہیں بنایا جا سکتا۔

یہی وجہ ہے جو سیاستداں غور و فکر کرنے پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ یقین و اعتماد کے حق میں ہوتے ہیں اور یقین و اعتماد اندھا ہوتا ہے اگر کوئی شخص کور چشم ہو تو اس کا استحصال کیا جا سکتا ہے۔ اندھا شخص خود اپنے مفادات کو نقصان پہنچا سکتا ہے' ایک نابینا شخص ہر قسم کے استحصال کا شکار ہو جاتا ہے چنانچہ اعتماد و یقین کی تعلیم دی جاتی ہے اور امید و آس کا سبق پڑھایا جاتا ہے' مذاہب یہ کچھ کرتے ہیں اور سیاستداں بھی یہی کرتے ہیں' سیاستداں کو عوامی سوچ سے خوف آتا ہے اگر سوچ پیدا ہو گئی تو نہ کوئی طبقہ ہوگا اور نہ کلاس۔ معاشی استحصال بھی ممکن نہیں ہوگا' یہ بھی ممکن نہیں رہے گا کہ موجودہ استحصال پچھلے جنم کا نتیجہ ہے۔

غور و فکر یا سوچ پیدا ہونے کے ساتھ انقلاب بھی آئے گا' ہر سطح اور ہر تعلق میں انقلاب' نتیجتاً نہ تو سیاستداں بچیں گے اور نہ سرحدیں قائم رہ پائیں گی۔ آدمیوں کے درمیان کھڑی تمام دیواریں منہدم ہو جائیں گی اسی لیے سرمایہ دار سیاستداں اور کمیونسٹ سیاستداں دونوں ہی سوچ سے ڈرتے ہیں اسی خوف کے خلاف موجودہ تعلیمی نظامی جاری و ساری رکھا گیا ہے۔ یہ نام نہاد تعلیم ایک بہت بڑی سازش ہے جو ہزاروں برس سے جاری ہے۔ ابتداء میں اس پر مذہبی پیشوا قابض تھے اور اب سیاستداں۔

غور و فکر کی عدم موجودگی کے باعث طاقتور شخصیت نہیں پیدا ہو سکتی کیونکہ اس کی بنیاد ہی نہیں رکھی جا رہی ہے۔ شخصیت کا بنیادی پتھر کیا ہوتا ہے؟ کیا خود اپنے ذہن سے سوچنے کی صلاحیت نہیں؟ لیکن یہ صلاحیت تو پیدا ہونے سے پہلے ہی تباہ کر دی جاتی ہے۔ گیتا پڑھائی جاتی ہے، بائبل پڑھائی جاتی ہے، داس کیپٹال اور کمیونسٹ منیفیسٹو پڑھائی جاتی ہے، اپنے ڈھانچے کو مدنظر رکھتے ہوئے سوچ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس قسم کی سوچ ہو تو اس سے بڑی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اندھی تکرار کو پڑھا کر کہا جاتا ہے کہ یہ تفکر ہے۔

جس کی بنیاد ایمان و یقین کے ڈھانچے پر رکھی جائے تو سوچ اور تفکر تو ناممکن ہوگا ایک آزاد سوچ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر طرح کے ڈھانچے سے آزاد ہو۔ تعلیم کے لیے ذہن میں اگر پہلے سے موجودہ کوئی ڈھانچہ ہو تو وہ صحیح نہیں۔ تعلیم کے لیے ایسا شعور فراہم کیا جانا چاہیے کہ ذہن غلام نہ بنے اور اپنی ذاتی سوچ کی صلاحیت پیدا ہو سکے اگر صحیح معنی میں توجہ دی جائے تو وہ یقینی طور پر پیدا ہو سکتی ہے۔ آزاد سچ کے بیج پہلے ہی ہر ایک شخص میں موجود ہوتے ہیں اور مناسب موسم میں وہ بیج پھوٹ کر کونپلیں نکال لیتے ہیں۔

کون ہے جس میں آزادی کی خواہش نہیں؟ کون ہے جو اپنی سوچ اور ذہانت کا طلب گار نہیں لیکن پورا تعلیمی نظام انسان کو غلام بنانے پر تلا بیٹھا ہے بجائے اس کے وہ آزادی کا احساس پیدا کرے۔ ایسی صورت میں حقیقی حیرانی ہے کہ چند لوگ ہی مشین بننے سے خود کو بچا پاتے ہیں یعنی غلام بنانے والے تعلیمی ڈھانچے کا امتحان پاس کر کے۔ کیا یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں کہ ایک شخص اس قسم کے تعلیمی ڈھانچے سے پاس ہونے کے بعد خود کو محفوظ کر لے۔

یونیورسٹیوں نے اصل ذہنی صلاحیتوں کو برباد کر کے اپنی کارکردگی کو بلند چوٹیوں تک پہنچا دیا ہے اگر زور دیا جاتا ہے تو اس پر کہ نظم و ضبط پیدا کیا جائے صرف اس لیے کہ انسان کی آزادی کو چھینا جا سکے۔ ذہانت کی کمی کو نظم و ضبط سے پورا کیا جاتا ہے اگر ذہانت ہو تو ایک شخص کی زندگی میں نظم و ضبط از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ نظم و ضبط سیکھا جائے وہ تو خود بخود پیدا ہو جاتا ہے لیکن جہاں ذہانت کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی وہاں ایک شخص کو تھونپے ہوئے نظم و ضبط پر انحصار کرنا ہوتا ہے اس قسم کا نظم و ضبط غلط ہوتا ہے کیونکہ اس کی جڑیں ایک شخص کی اپنی ذہانت میں نہیں ہوتیں۔ فرد کا ضمیر یا حسنِ اخلاق کا شعلہ ہمیشہ اندر ہی اندر، تھونپے ہوئے نظم و

ضبط کے خلاف سلگتا رہتا ہے اس قسم کے نظم و ضبط کے ردعمل کے طور پر غیر اخلاقی جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ غیر اخلاقی رویہ ہمیشہ غلامی کا ردعمل ہوا کرتا ہے یہ غلامی کی وہ بازگشت ہوتی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آزادی سے بھرا ہوا شعور غیر اخلاقی کا مرتکب نہیں ہو سکتا اگر کسی شخص کو اخلاقی بے راہ روی سے محفوظ کر دیا جائے تو اس کی روح کو مکمل آزادی کا ماحول میسر ہوگا بہر حال ہمارے عمل میں صرف دو متبادلات ہیں یا تو غلامی یا پھر غیر اخلاقی حرکات۔ ہم ابھی تک آزادی کے ثنا خواں نہیں ہو سکے۔

ایسا نظم و ضبط جو ایک شخص دوسروں پر تھونپتا ہے وہ بجائے خود بھی غلامی ہے، اس قسم کا نظم و ضبط ہر طرف پھیلا ملے گا اور اس نے بے چینی کی لہر دوڑا رکھی ہے اس قسم کے نظم و ضبط کو بہر حال ختم ہونا ہے اسے ختم ہو جانا چاہیے کیونکہ جن وجوہات کے سہارے یہ کھڑی ہے وہ غلط ہے اس کی موت، اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ اس نظم و ضبط کے اندر خود اپنے کو روک دینے کے لیے انتشار اور بدنظمی چھپی بیٹھی ہے اور جس چیز کو قوی انداز سے روکا جائے وہ ایک نہ ایک دن دھماکے سے اڑ جاتی ہے۔

جب اس قسم کا نظم و ضبط قائم ہوتا ہے تو انسان کے شعور سے سچی خوشی اور فطری نکھار کو ختم کر دیتا ہے اور جب وہ رخصت ہوتا ہے تو انسان انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ باہر سے تھونپا جانے والا نظم و ضبط انسان کے مفاد میں نہیں ہوا کرتا۔ تعلیم باہری نظم و ضبط سے پاک ہونی چاہیے۔ اس طرح انسان کی پوشیدہ ذہانت ختم ہو جاتی ہے۔ اس ذہانت کا اپنا نظم و ضبط ہوتا ہے اس زندگی میں نہ تو کوئی بیخ کنی ہوتی ہے اور نہ بھاری پن اس قسم کی زندگی سادہ اور قدرتی ہوتی ہے جیسے کسی پھول کی، جب کسی کی زندگی اپنی ذاتی ذہانت کی روشنی میں آگے بڑھتی ہے تو اخلاقی بے راہ روی اور انتشار وغیرہ ممکن نہیں رہتا جہاں بیخ کنی نہ ہو وہاں انتشار کا دھماکا اور اخلاقی بے راہ روی بھی نہیں ہوتی۔

میرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم انسان کو آزاد نہیں کر سکتے؟ ایسا لگتا ہے کہ آزادی کی صورت میں اخلاقی بے راہ روی کا خطرہ محسوس کیا جاتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ہم نے ہمیشہ غلامی میں انسان کی بیخ کنی کی ہے اور اس کی روح نے ہمیشہ غلامی کے خلاف جدوجہد کی ہے اور جب بھی

ممکن ہوا اس نے ان زنجیروں کو توڑا ہے لیکن جب بھی اسے توڑنے کی کوشش کی گئی تو روح سخت بدمزہ ہوئی کیونکہ سختی اور مخالفت اسے بے راہ رو بنا دیتی ہے، بجائے اس کے کہ آزادی سے ہمکنار کرے۔ آزادی تعمیری ہوتی ہے جبکہ اخلاقی بے راہ روی تباہ کن اگر ہم اخلاقی بے راہ روی سے چھٹکارا چاہتے ہیں تو اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں کہ آزادی دی جائے۔

یقیناً تعلیم ایسی بنیاد رکھ سکتی ہے جس سے انسان آزادی سے بہرہ مند ہو سکے۔ ہمیں اب نظم وضبط کے پابند لوگوں کی قطعی ضرورت نہیں، ہمیں تو ایک ایسا انسان درکار ہے جس کی جڑیں آزادی اور ذہانت میں ہوں ایسے ہی لوگوں سے امید کی جا سکتی ہے اور وہی مستقبل میں۔

نظم وضبط کے حصول کا طریقہ عمل کیا ہے؟ نظم وضبط نے انسان کو بے وقوفی اور بے حسی دی ہے۔ ایک ایسا شخص جو نظم وضبط کا پابند ہو وہ سخت گیر ہوتا ہے۔ جتنا وہ سخت گیر ہے اتنا ہی نظم وضبط کا پابند ہوگا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مشینیں کتنی منظّم ہوتی ہیں، ذہانت ہمیشہ ہر بات میں ہاں نہیں کہتی وہ بھی یہ جانتی ہے کہ انکار کس طرح کیا جائے، آپ کی ہاں میں معنی و مطلب اسی وقت ہوگا جب آپ کے علم میں ہو کہ نہیں کس وقت کہا جاتا ہے لیکن نظم وضبط کبھی یہ نہیں سکھاتا کہ نہیں بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ ہاں کہے گا اگر نظم وضبط کے پابند شخص سے کہا جائے کہ اسے قتل کرو، تو وہ کر دے گا یہ صورت حال صرف اس لیے ہے کہ دنیا بھر میں جنگ، تشدد اور ہر قسم کی بے ہودگی جاری ہے اور جاری رہے گی۔

کیا ہم اس گھناؤنے دائرے کو ختم نہیں کر سکتے؟ کیا نظم وضبط کی تعلیم صرف ایٹمی جنگ ہونے کے بعد ہی ختم ہوگی؟ لیکن نیوکلیئر جنگ کے بعد جو سچ پوچھیں تو اس کی ضرورت ہی نہیں ہوگی کیونکہ اس جنگ کے بعد نہ تو نظم وضبط کی تعلیم دینے والے بچیں گے اور نہ نظم وضبط کے حامل لوگ۔ مستقبل کی انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ نظم وضبط کے پابند لوگ ہیں نہ کہ کوئی دوسرا شخص کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حکم کی تعمیل کس طرح ہوتی ہے وہی فرماں بردار لوگ ہمیشہ نیوکلیئر ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اگر نظم وضبط کی بجائے ذہانت کی تعلیم دی جائے تو یہ دنیا یکسر مختلف ہوگی اسی طرح اگر غور و فکر کرنے کی تعلیم دی جائے بجائے فرماں بردار بنانے کے تو بھی نتائج حیران کن نکلیں گے۔

تعلیم کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ نظم وضبط سکھایا جائے بلکہ ذہانت کو بڑھانا ہوتا ہے۔ ذہانت

سے جو نظم وضبط برآمد ہوتا ہے اسی میں اچھائی اور برگزیدگی ہوتی ہے کیونکہ ایسے نظم وضبط کا استحصال نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مذہبی پیشوا اور سیاستداں جنگ اور تشدد کے لیے نہیں استعمال کر سکتے۔ ذہانت کے ذریعے پیدا شدہ نظم وضبط کے حامل ہندو افراد کو مسلمانوں سے جنگ و جدل کرنے کے لیے تیار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی موت کی تباہی پھیلائی جا سکتی ہے وہ بھی تصوراتی اور غلط قومی سرحدوں کے نام پر۔

نظم وضبط اور فرماں برداری کے نام پر کیا کیا غلط احکامات نہیں صادر کیے جاتے؟

سوسائٹی جو کچھ سوچتی ہے اسے اساتذہ نئی نسل کو نظم وضبط کے نام پر تیار کرتے ہیں۔ اساتذہ بہت قسم کے استحصال کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں وہ بہت ساری بیماریاں پھیلانے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اس بات سے واقف ہی نہ ہوں کیونکہ وہ تو خود بھی اسی طرح کی تعلیم کا شکار رہے ہیں۔

نسل پر نسل گزرتی جا رہی ہے اور ورثے کے طور پر اپنی نفرتیں، دشمنیاں اور حماقتیں اساتذہ کے ذریعے نئی نسل پر تھوپی جا رہی ہیں جس کے ساتھ امراض اور ناسمجھی تجربے اور جانکاری کا اضافہ بھی ہوتا ہے اپنی بیماریوں اور تجربے کے اضافے سے صورتِ حال کچھ زیادہ ہی تباہ کن ہو جاتی ہے کیونکہ اپنی دشمنیوں اور اندھے اعتقاد کے ساتھ اس میں خودی اور تسکین کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ ایک ہندو باپ اپنے بچوں کو پڑھاتا ہے کہ وہ ہندو بنے۔ ایک جینا اپنے بچوں کو پڑھاتا ہے کہ وہ جینا رہے اور ایک مسلمان اپنے بچوں کو پڑھاتا ہے کہ وہ مسلمان بنے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو منفی زندگی کے مذہبی فرقوں میں بانٹ دیں جس میں وہ خود پل کر بڑے ہوئے ہیں۔

بہت سے تعلیمی ذرائع سے یہ زہر پھیلایا جا رہا ہے اس زہریلی تعلیم کے باعث انسانی نسل ایک ہونے کی اہل نہیں رہی اور ہماری آنکھیں اس مذہب پر نہیں پڑ سکیں جو ایک ہے اور ایک ہو سکتا ہے، اسی طرح قومیت پڑھائی جاتی ہے اور قومی خودی مضبوط کی جاتی ہے۔ ہر قوم تیار ہے اور دوسری اقوام کے مدمقابل کھڑی ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں تشدد پیدا ہو رہا ہے اور جنگ کی آگ مسلسل روشن، جہاں کہیں انا ہوگی، وہاں جنگ اور تشدد ہوگا۔ اس قسم کی دوسری بیماریاں بھی ہیں جس کے جراثیم کو اساتذہ معصوم بچوں میں پھیلا رہے ہیں۔ یہ انتہائی گھناؤنے

جرائم میں سے ایک جرم ہے جو انسانوں کے خلاف روا رکھا گیا ہے اگر اساتذہ چوکس ہوں تو ہی اس جرم میں ساجھے داری سے بچ سکتے ہیں۔

سوسائٹی کی طاقتور شخصیات نہیں چاہتیں کہ معاشرتی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی کی جائے کیونکہ وہ طاقتور ہیں اور ان کی قوت' مفادات اور استحصالی حیثیت کا دارومدار اسی پر ہے۔ ٹیچر اس ڈھانچے کو بچوں کے ذہنوں میں منتقل کرتا ہے وہ پرانے رواج کو نئی نسل تک پہنچا رہا ہے وہ اس سے انحراف کا کوئی سبق نہیں پڑھاتا اور جہاں کوئی انحراف کوئی بغاوت نہ ہو وہاں کوئی نمو کوئی افزائش نہیں ہوتی۔

ایک استاد کے فرائض کیا ہوتے ہیں؟

اس پر فرض ہے کہ وہ بچوں کو طرز کہن کے خلاف بغاوت اور انحراف کرنا سکھائے۔ جس دن تعلیم میں طرز کہن کے خلاف بغاوت شروع ہوئی اس دن ایک قطعی نئی انسانیت وجود میں آ جائے گی۔

بغاوت کے کیا معنی ہیں؟ اسکا مطلب ہے کہ اقدار کا انقلاب' اس میں شبہ نہیں کہ زندگی کی اقدار غلط ہیں ورنہ اتنی زیادہ پریشانی اور ہلچل نہ ہوتی۔ انسان کی زندگی میں الجھاؤ اور بے مقصدیت نہ ہوتی؟ یہ گھناؤنا پن' یہ تشدد یہ تنفر اور لامذہبیت' کیا یہ سب کچھ بلاوجہ ہے؟ نئی زندگی کی اقدار غلط ہیں اور یہ سب کچھ اسی کا نتیجہ ہے' زندگی کی اقدار کو تبدیل کرنا ہے انسان کو نئی اقدار کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ایک عظیم بغاوت کی شاید ضرورت ہے۔

ٹیچر کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونا پڑے گا' ٹیچر کے علاوہ کوئی دوسرا BHAGIRATA نہیں ہے۔ ہندوستان کی دیومالائی شخصیت جو آسمان سے بغاوت کی گنگا دنیا پر بہا سکتی ہے۔

لیکن ٹیچر بہت غلط فہمی میں مبتلا ہے ممکن ہے سوسائٹی اسے بہتر مشاہرہ نہ دے کر فاقوں مار رہی ہو لیکن اس کے لیے بے پناہ احترام دکھاتی رہتی ہے۔ ٹیچر کی ہمیشہ عزت کی گئی اور احترام دیا گیا۔ اس کی انا کو یہ کہہ کر تسکین دی گئی کہ وہ عزت و احترام کا حقدار ہے اور یہ کہہ کر اسے شدید مغالطے میں رکھا گیا چنانچہ نئی نسل کو پرانے فرمے میں ڈھالنے کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ ٹیچر کو عزت و احترام دیگر اس کا استحصال کیا گیا۔ سوسائٹی ٹیچر کو بلاوجہ احترام نہیں دیتی۔ دیئے گئے احترام کے عوض' سوسائٹی ٹیچر سے بہت سستے داموں بہت بڑا کام لیتی ہے۔ میرا

آپ سے سوال ہے کیا ٹیچرز کو اس صورت حال کا اندازہ ہے؟

انسانی تاریخ بے وقوفیوں سے بھری ہوئی ہے ان کے سامنے ہر طرف اندھا اعتقاد اور غلط علوم کھڑے ہوئے ہیں لیکن ٹیچر نئی نسل کو ان زنجیروں سے آزاد نہیں کر رہے ہیں، اس نے ماضی کی غلامی کا ثبوت دیا ہے چنانچہ مستقبل کا دشمن بن گیا ہے کیا یہ مناسب ہے کہ ماضی کا بوجھ ہمارے سروں پر ہونا چاہیے؟ ماضی کو نیچے ہمارے پیروں تلے ڈال دو یہ کسی بھی صورت ہمارے سروں کا بوجھ نہیں ہونا چاہیے۔ مستقبل کی تعمیر کے لیے ماضی سے پاک دماغ کی ضرورت ہے۔ ماضی کے تجربات کو انسان کے علم میں شامل تو کرے لیکن اس کا اسیر نہ بنائے کیونکہ انہیں ان سے بہت آگے جانا ہے' سفر کا آغاز ماضی سے ہے لیکن یہ سفر کی انتہا نہیں ہے اسے آگے اور آگے جانا ہے اس جگہ سے جہاں ماضی کی نسل نے اسے چھوڑا تھا۔ ہر نسل کو ہر سلسلے میں ماضی کی نسل کو شکست سے دوچار کرنا ہے صرف مادی چیزوں میں ہی نہیں بلکہ ذہنی اور مذہبی باتوں میں بھی اس میں شبہ نہیں کہ اس سے ماضی کی نسل کی انا کو ٹھیس پہنچے گی اور اسی انا کے باعث ماضی کی نسل یہ نہیں چاہے گی کہ کوئی ترقی اور بڑھوتری اس سے آگے نکل جائے۔

انسان کو ماضی کے کھونٹے سے باندھ دینا' انتہائی نقصان دہ ہے لیکن پرانی نسل کے لوگ ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل کے لوگوں پر وہی صحیفے اور اصول نافذ رہیں اور یہ سلسلہ سیکڑوں برسوں سے جاری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کی روح کو اتنی بالیدگی نہیں مل پائی جتنی کہ مل سکتی تھی۔ وہ اتنی بلوغت یا پختگی نہ حاصل کر سکی جتنی کر سکتی تھی۔ وہ ماضی کے کنکر پتھر میں دب کر رہ گئی' اس پر اتنا زیادہ وزن پڑ گیا کہ وہ اوپر نہیں چڑھ سکتی۔

تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کی روح سے وزن کو اٹھا پھینکے کیونکہ ہلکی پھلکی روح ہی اونچی اڑ کر تقویٰ کی بلندیوں تک پہنچ سکتی ہے مردہ بیج کا وزن' بیج کے شعور کو پھوٹ کر کونپل نہیں بننے دیتا اس طرح آہستہ آہستہ بیج گل سڑ کر اسی زمین میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک شخصیت کا بیج ماضی کے وزن کو ہٹائے بغیر پھل پھول سکے۔ ماضی کی پکڑ اگر کمزور ہوگی تو ہی ایک شخص پروان چڑھ سکے گا۔ ماضی ایک سیڑھی جیسی چیز ہوتا ہے جس پر چڑھ کر اوپر پہنچتے ہیں اور اسے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اگر آپ اس سیڑھی کو اپنے سر پر اٹھائے پھریں تو یہ دانائی نہیں ہوگی۔

اس دنیا میں مادی دولت بڑھتی جا رہی ہے کیونکہ ہر نسل اسے بہت دور سے حاصل کرتی ہے جیسا کہ ماضی کی نسل نہیں کیا کرتی تھی لیکن روحانی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے کیونکہ ہمارا ذہن ماضی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک بیٹا بلا کسی ہچکچاہٹ کے ایک نیا گھر تعمیر کر دیتا ہے جہاں اس کے باپ کا گھر تھا لیکن کوئی چھپا ہوا خوف ہمیں اس وراثت کو ترقی دینے سے روک دیتا ہے جسے راما، کرشنا، بدھا، مہاویر یا حضرت عیسیٰ نے چھوڑا ہے۔ یہ خوف اصل نہیں، پڑھایا گیا خوف ہے، ایک عائد کردہ خوف۔

گیتا پر کہانی تو لکھی جا سکتی ہے لیکن گیتا میں جو سوچ پیش کی گئی اس پر غور و فکر کی اجازت نہیں۔ اس طرزِ عمل نے انسان کو نہ صرف اپاہج بلکہ روحانی طور پر مفلس کر دیا ہے اگر بیٹا باپ سے زیادہ پھلے پھولے اور آگے نکل جائے تو ٹھیک، اس سے باپ کی نہ توہین ہوتی ہے نہ بے عزتی۔ جو سچ پوچھیے تو اس سے باپ کی عزت و تکریم میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ مقام اس کے لیے فخر کا مقام ہوتا ہے۔

ہر نسل کو نئی آنے والی نسل کے لیے اسی طرح تیاری کرنی چاہیے جیسے پرانی نسل کو ہر معاملے میں پیچھے چھوڑنا ہے یہ خواہش کہ نئی نسل کو پرانی نسل سے جڑ کر چلنا چاہیے اور اسے پرانی نسل کی حدود میں ہی رہ کر زندگی گزارنی چاہیے ایک کمزور اور بیمار خواہش ہے جس سے صحت مند ذہن نہ ہونے کا پتا چلتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام پر غور و فکر کیا جائے جو پرانی نسل کی حدود کو قائم و دائم رکھنے میں معاونت کر رہا ہے۔

میں اس پاگل پن کو سمجھنے سے قاصر ہوں میری دلی خواہش یہ ہے کہ میرے بعد پیدا ہونے والے، مجھ سے ہر معاملے میں آگے ہوں اور وہ ایک ایسی دنیا تعمیر کریں جو ہمارے تصور میں بھی کبھی نہیں آ سکی۔ ان کی روح چمک دار اور سوچ خالص ہو اور ان کی بصیرت اس سچائی کو دیکھ سکے جسے ہم نہیں دیکھ سکے اور ان کے قدم ان نئے راستوں پر پڑیں جنہیں ہم نے خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ محبت کی خواہش اور دعا بس اتنی سی ہے میں اپنے بچوں کو اپنے علم اور تجربے تک محدود نہیں کروں گا، میں چاہوں گا کہ وہ آزاد ہوں۔

محبت تو ہمیشہ آزاد ہوتی ہے وہ محبت جس میں پابندیاں ہوں وہ محبت نہیں ہوتی بلکہ ایک روگ ہوتا ہے۔

تعلیم میں مستقبل کی نشاندہی ہونی چاہیے ماضی کی نہیں، صرف اسی صورت میں ترقی ممکن ہوگی۔ تخلیقی عمل بھی صرف اور صرف مستقبل کی نشاندہی کر رہا ہو۔

اس لیے کیا یہ صحیح نہیں ہوگا کہ ہم محبت اور احترام کا درس دیا کریں؟ ماضی کا مطلب ہوتا ہے کہ گزرا ہوا زمانہ، وہ زمانہ جو ختم ہو چکا اور اس کا وجود نہیں رہا سوائے یادوں کے لیکن ہمارے تمام اصول، ہمارا تصور، ہمارا خیال ماضی سے فراہم ہوا ہے۔ اس طرح زندہ لوگوں پر مردہ لوگ حکومت کر رہے ہیں۔ مرے ہوئے لوگوں کی عزت و احترام ایک الگ چیز ہے لیکن ان کی حکمرانی ایک دوسری چیز، بہرحال ہم پر ماضی کی حکمرانی چاہے وہ عزت و احترام کے لیے ہی کیوں نہ ہو، صحیح نہیں کہلا سکتی۔

دل کی گہرائی سے ماضی کا احترام صرف اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب وہ ہم پر مسلط نہ ہو۔ وہ احترام بہت جذباتی اور پر جوش ہوگا۔ اس قسم کے احترام میں ممنونیت اور تپاک ہوگا۔ اس ممنونیت سے ہم کو قدغن نہیں لگے گی بلکہ وہ ہمیں ہلکا پھلکا کر دے گی۔ وہ لوگ جو ہمیں آزادی عنایت کرتے ہیں ان کے لیے ہمارا دل ممنونیت کا بے اختیار اظہار کرتا ہے۔ قدغن لگانے والوں سے ممنونیت نہ قدرتی ہوتی ہے اور نہ ممکن۔

تعلیم کو تبلیغ بنا دیا گیا ہے یقیناً اسے علم کا مبلغ ہونا چاہیے اگر تعلیم غلامی کو بڑھا رہی ہو تو اسے علم کا مبلغ یا داعی نہیں کہا جا سکتا۔ علم وہاں ہوتا ہے جہاں ذہن آزاد ہو اگر ذہن محکوم ہو تو اس میں علم کیسے سما سکتا ہے؟ علم تو خود آزادی ہوتا ہے۔

تعلیم خوف بڑھاتی ہے، تعلیم لالچ سکھاتی ہے، تعلیم نفرت کرنے کا درس دیتی ہے، مقابلہ اور مسابقت بڑھاتی ہے۔ تعلیم کامیابی حاصل کرنے کی امنگ کا بخار چڑھاتی ہے پھر اس قسم کی تعلیم، علم کا مبلغ کیسے ہو سکتی ہے؟ ایسی تعلیم آزادی کیسے دلا سکتی ہے؟ یہ تو مہلک اور جان لیوا امراض بڑھا رہی ہے، دوستو! یہ علم کی تبلیغ نہیں بلکہ جہالت کی تبلیغ ہے۔

میں جب دیکھتا ہوں تو دکھائی دیتا ہے کہ خوف سے بڑا کوئی دوسرا مرض نہیں۔ زندگی میں خوف سے بڑھ کر دوسری کوئی چیز نہیں جس سے خوف کھایا جائے؟ خوف ایک شخص کو مفلوج کر دیتا ہے۔ خوف بغاوت کی پوری صلاحیت کو برباد کر دیتا ہے۔ خوف کسی تبدیلی کو ناممکن کر دیتا ہے، خوف جانی پہچانی چیزوں سے جوڑ دیتا ہے اور تمام انجانی چیزوں سے روک دیتا ہے حالانکہ

اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ زندگی کی تمام انجانی چیزوں کو حاصل کیا جائے۔

خدا نامعلوم ہے (یعنی خدا کا کوئی چہرہ یا شبیہ نہیں) سچائی نامعلوم، حسن اور خوب صورتی نامعلوم، محبت نامعلوم لیکن خوف میں ڈوبا ہوا ذہن معلوم۔ یہ کھینچی ہوئی لائن سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ چلے ہوئے راستے پر ہی چلتا رہتا ہے۔ وہ مقررہ راستے سے کبھی نہیں ہٹتا۔ خوف زدہ شخص مشین جیسا ہوتا ہے وہ اطاعت گزار سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ مذہب خوف کی تعلیم دیتا ہے، جہنم کا خوف، گناہوں اور سزاؤں کا خوف، اسی طرح سوسائٹی بھی خوف کا سبق پڑھاتی ہے۔ بے عزتی اور ذلت ورسوائی کا سبق، تعلیم کے نام پر خوف پڑھایا جاتا ہے، فیل ہو جانے کا خوف۔

اس کے ساتھ ساتھ لالچ منسلک ہوتی ہے، جنت کی لالچ، نیکی اور راستی کی لالچ، عزت و تکریم کی لالچ، پوزیشن، شہرت، کامیابی اور انعام واکرام کی لالچ، ہر قسم کی لالچ خوف کے سکے کا دوسرا پہلو ہے۔ موجودہ شعوری سسٹم میں ایک شخص مکمل خوف اور لالچ ہے۔ نفرت اور مقابلے کی آگ روشن کردی گئی ہے۔ کامیابی اور امتیاز حاصل کرنے کی امنگ کا بخار پیدا کردیا گیا ہے۔ یہ کسی حیرت کی بات نہیں اگر اس حرکت کے دائرے میں زندگی کا ضیاں ہو جائے۔

اس قسم کی تعلیم انتہائی خطرناک ہے تعلیم وہ ہے جو بے خوفی کا سبق دے، لالچ کی بجائے سیر چشمی کو فروغ دے جو بے خوفی کو پروان چڑھائے، ہمت کو بڑھائے کہ وہ انجانے چیلنجز کو قبول کرے۔ تعلیم کو نفرت اور مقابلہ کرنیکا سبق نہیں پڑھانا چاہیے، اس کی جگہ محبت کا درس دیا جائے اسے بے وقوفی کی امنگوں کے لیے نہ ابھارا جائے اس کی جگہ قدرتی اور وجدانی بڑھوتری کو فروغ دیا جائے یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ہم سب ہر آدمی کی شخصی انفرادیت کو تسلیم کریں۔

ایک شخص سے دوسرے کا مقابلہ یا موازنہ کرنا بنیادی غلطی ہے۔ موازنے سے مقابلہ جنم لیتا ہے کوئی شخص نہ آگے ہوتا ہے اور نہ پیچھے۔ کوئی شخص نیچے ہے نہ کوئی اوپر۔ ہر شخص وہی ہے جو ہے اور ہر شخص کو وہی رہنا چاہیے۔ مثالی نمونہ (IDEAL) بننے کی تعلیم مذکورہ خصوصیات نہیں پیدا ہونے دیتی۔ بچوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ راما جیسے ہوں اور گاندھی جیسے۔ اس سے زیادہ غلط بات اور کیا ہو سکتی ہے، کیا کوئی شخص دوسرے جیسا ہو سکتا ہے یا کوئی کبھی دوسرے جیسا ہوا ہے؟ کسی کا راما بننا ممکن نہیں، ہاں ایک شخص ڈرامے کے اندر راما ضرور بن سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے جو پوری دنیا میں مکاری اور بناوٹی تقویٰ پھیلا ہوا ہے یہ مکاری اور بناوٹی تقویٰ ہے کیا یہ آئیڈیل کی پرچھائیں ہے جب تک مثالی نمونہ بننے کی خواہش بچوں کے سر تھونپی جائے گی اس وقت تک یہ مکاری اور بناوٹی تقویٰ جاری رہے گا۔ اگر مکاری (Hypocrisy) کو ختم کرنا ہے تو مثالی بننے کا تصور ختم کرنا ہوگا حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے جیسا نہیں پیدا ہوتا بلکہ ہر شخص صرف اور صرف اپنے جیسا ہوتا ہے ہر شخص کو موقع دیا جانا چاہیے کہ اس کے اندر چھپے ہوئے بیج کو وہ ایک توانا درخت میں تبدیل کرے۔

جب تعلیم ہر شخص کی الگ الگ ندرت کو تسلیم کرلے گی اسی وقت سے عظیم انقلاب کی ابتداء ہو جائے گی اس وقت سے ہم کسی پر کسی قسم کا ڈھانچہ تھوپنے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ ہر شخص کے اپنے بیج کی آبپاری کرنے لگیں گے تاکہ وہ پھلے پھولے کیونکہ مثالی نمونہ بننے میں بہت زیادہ تشدد نے جنم لے رکھا ہے اور ہم کسی کو یہ موقع نہیں دے رہے ہیں کہ وہ وہی بنے جو بن سکتا ہے۔ ایک دوسرا شخص بننے کی کوشش میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ دوسرا شخص نہ بنے بلکہ وہ بھی یا ویسا بھی نہیں بن پاتا جیسا کہ بن سکتا تھا۔

میں انتہائی اخلاص کے ساتھ آپ سے ملتجی ہوں کہ ہر شخص کو وہی بننے دیں جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ ایک گلاب کا پھول، گلاب کا پھول اور گلِ یاسمین گلِ یاسمین ہے۔ نہ کوئی چیز انتہائی اعلیٰ اور نہ کوئی چیز انتہائی ادنیٰ ہے۔ گلاب کا پھول، گلِ یاسمین نہیں ہو سکتا اور گلِ یاسمین، گلاب کا پھول نہیں ہو سکتا۔ بڑے اور چھوٹے کی درجہ بندی یا اونچے نیچے کی اصطلاح غلط اور مہمل ہے۔ اس درجہ بندی کو ختم کر دیجیے، ایک شاعر موچی سے زیادہ عظیم نہیں ہوتا اور سیاستداں بھی کسی دوسرے سے زیادہ اعلیٰ نہیں ہوتا۔ کوئی استاد صدر مملکت بن کر اونچا نہیں ہو جاتا۔

زندگی اشتراکِ عمل اور تعاون کا نام ہے اس میں ہر شخص یکساں، ضروری اور ناقابل تردید ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ پوری دنیا عظمت کے جنون میں کس طرح مبتلا ہے تاکہ وہ شہرت اور اعلیٰ مقام تک پہنچ جائے؟ یہ کتنا پاگل پن کا مقام ہے کہ گلاب کی پھول سے کہا جائے کہ وہ گلِ یاسمین بن جائے اور گھاس کی پتی سے کہا جائے کہ وہ کنول بن جائے۔ سمجھ میں آنے والی بات تو یہ ہے کہ گلاب کے پھول کی شگفتگی اپنا عروج پائے، گھاس کی پتی کی شادابی پوری بلندیوں پر ہو اس کی پتیاں شباب سے پُر ہوں اور ان کی خوشبو کم نہ ہونے پائے۔

زندگی میں اس سے بڑی مسرت کوئی نہیں کہ ایک شخص اپنی صلاحیت کے مطابق پھولے پھلے تعلیم کا صحیح راستہ یہی ہے۔

اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ کسی کو مثالی بننے کی تعلیم دی جائے' اس بات کی بھی ضرورت نہیں کہ کسی کو یہ پڑھایا جائے کہ وہ فلانے شخص کا اتباع کرے۔ ہر قسم کی کوششوں کا مقصد و محور یہ ہونا چاہیے کہ ہر شخص اپنی انفرادی خصوصیت کو پروان چڑھائے۔ صرف اسی طرح ممکن ہو سکے گا کہ ہم بڑے بڑے تصورات اور نفرت کے بخار سے محفوظ رہ سکیں اس کے بعد ہی ایک ایسی سوسائٹی وجود میں آ سکے گی جس میں امن ہوگا اور ہر شخص برابر ہوگا۔ ایک ایسی سوسائٹی جو امتیاز کی امنگ سے پاک ہو، وہی طبقہ واریت سے پاک اور مساوات پر مبنی ہو سکتی ہے ایسی سوسائٹی میں استحصال بھی نہیں ہوگا۔

کیا ایسی تعلیم ممکن نہیں ہے جس کی بنیاد امتیاز کی امنگ سے پاک ہو؟ کیا حساب (Maths) اور موسیقی اس لیے پڑھی جاتی ہے کہ کلاس کے دوسرے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا جائے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ریاضی کو اس لیے پڑھا جائے کہ اس سے محبت ہے اور موسیقی اس لیے کہ موسیقی سے پیار ہے؟ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی اسی وقت سیکھی اور اس کی گہرائی کا تجربہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اسے کسی دوسرے شخص سے مقابلے کے جذبات کے بغیر سیکھا جائے۔

کیا مقابلہ کرنے والا شخص موسیقی سیکھ لے گا؟ مقابلہ تو خود اپنی ذات سے بے آہنگ ہوتا ہے موسیقی ایسے لوگوں سے جانی جاتی ہے جو آہنگ و آواز میں سراسر ڈوبے ہوئے ہوں' ان لوگوں کی وجہ سے نہیں جو مقابلہ کرتے پھر رہے ہوں۔ گہرائی میں اترنے اور مقابلے کے درمیان مزاحمت اور مخاصمت ہوتی ہے۔ مقابلے میں کھنچاؤ ہی کھنچاؤ ہوتا ہے جبکہ گہرائی میں اترنا سکون و اطمینان کا باعث۔ مقابلے میں ایک قسم کا بخار ہوتا ہے جو آپے سے باہر کر دیتا ہے۔ گہرائی میں اترنا صحت مندی ہے کیونکہ اس سے ایک شخص اپنی ذاتی گہرائی میں اتر جاتا ہے۔ سیکھنا گہرائی میں اترنے کے آرٹ کی تعلیم ہے۔ آپ کو پڑھایا کیا جاتا ہے کہ دوڑو' مقابلہ کرو' میں اسے غلط تعلیم کا نام دیتا ہوں۔

ایک بار میں ٹیچرز کی ایک میٹنگ میں گیا اس دن ٹیچرز ڈے منایا جا رہا تھا وہاں میں نے

ان لوگوں سے پوچھا ''اگر ایک استاد صدر مملکت بن جاتا ہے تو اس میں اس کی کیا توقیر ہے؟ کیا استاد کم درجے کا اور صدر اونچے درجے کا شخص ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو تعلیم اور ٹیچر کا کیا وقار و منزلت ہوئی۔ وقار اور منزلت تو سیاستدانوں اور سیاست کی ہوئی۔ ہاں اگر کوئی صدر اپنا عہدہ چھوڑ کر ٹیچر بن جائے تو یقیناً یہ استاد کے وقار اور منزلت کا مقام ہوگا۔

ہم جب تک سیاستدانوں کو اعلیٰ مقام دیتے رہیں گے تو گویا بچوں کو سیاست پڑھاتے رہیں گے۔ سیاستداں ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ طلبا اور ٹیچرز کو سیاست سے الگ رہنا چاہیے۔ لیکن سیاستدانوں کا اعلیٰ مقام و مرتبہ دوسروں کی توقعات میں ابھرتا رہے گا۔ اس میں کوئی حیرت نہیں ہوگی کہ ٹیچر وزیر تعلیم' نائب صدر یا صدر بننے کا خواب دیکھے اور اگر وہ اپنے خواب کی تعبیر پانے کی جدوجہد میں لگ جائے تو یہ قدرتی امر ہوگا۔

تعلیم اعلیٰ امنگوں سے نجات کا نام ہے' اعلیٰ امنگ سیاست ہے۔ یہ امنگ کا ہی نتیجہ ہے جس کی وجہ سے سیاست نے اعلیٰ مقام کے چبوترے پر بلندی پائی ہے جہاں مقام و مرتبہ ہے وہاں عزت ہے جہاں طاقت ہے وہیں مقام و مرتبہ ہے جہاں ایک حاکم ہے وہاں طاقت ہے۔ اسی دوڑ کی وجہ سے زندگی میں تشدد نے جنم لیا ہے امنگوں بھرا ذہن' تشدد بھرا ذہن ہے۔ عدم تشدد کا درس دیا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ مقام کی انگ کا سبق بھی۔ اس سے بڑی احمقانہ بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

عدم تشدد محبت ہی محبت ہے جبکہ امنگ مقابلہ۔ محبت میں پیچھے رہ جانے کا احساس اور جذبہ ہوتا ہے۔ مقابلے کا جذبہ چاہتا ہے کہ سب سے آگے رہے حضرت عیسیٰ نے کہا تھا متبرک اور خوش نصیب لوگ پیچھے رہنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ میں جس سے محبت کرتا ہوں تو چاہوں گا کہ وہ میرے سامنے سب سے آگے ہو اور اگر میں سارے لوگوں سے محبت کرتا ہوں تو لائن میں سب سے پیچھے رہنے میں خوشی محسوس کروں گا لیکن مقابلے کے جذبات اس کے عین برخلاف ہوتے ہیں اس میں نفرت' بغض اور تشدد ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ سب سے آگے رہنا چاہتا ہے بہرحال ہر صورت میں۔

آگے رہنے کی یہ دوڑ تعلیمی اداروں سے شروع ہوتی ہے اور قبر میں ہی جا کر ختم ہوتی ہے۔ وہی دوڑ' ہر ایک شخص میں موجود ہے وہی دوڑ پوری اقوام میں ہے اس دوڑ کے نتیجے میں جنگ

یقینی ہے یہ دوڑ آخر کیوں جاری ہے اس کی جڑیں کہاں ہیں؟ اس کی جڑ انسان کی انا میں ہے۔ انا کا سبق دیا جاتا ہے اور انا ہی کو ذہنوں میں بھرا جاتا ہے۔

چھوٹے بچوں کو انا پڑھاتے ہیں اور اس بارے میں ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے اس کا صاف ستھرا معصوم ذہن انا کے زہر سے بھر دیا جاتا ہے۔ ان کی ہمت افزائی اس لیے بھی کی جاتی ہے کہ وہ اول آئیں ایسے لوگوں کو گولڈ میڈل' میرٹ سرٹیفکیٹ اور دیگر انعامات بھی دیئے جاتے ہیں۔ یہ انا پرستی ایک بھوت کی طرح ساری زندگی ان کے پیچھے لگی رہتی ہے اور موت کے بعد ہی جان چھوڑتی ہے۔ اخلاص کے متعلق وعظ تو کیے جاتے ہیں لیکن جو چیز پڑھائی جاتی ہے وہ انا پرستی ہے۔

کیا تاریخ کا یہ انتہائی اچھا دن نہیں ہوگا جب انا پرستی کی تعلیم ختم ہو جائے گی انا اور خود پسندی نہیں بلکہ محبت اور پیار کی تعلیم دی جانی چاہیے جہاں انا' خود پسندی اور انفرادیت کا احساس ہے وہاں محبت اور پیار ہونا چاہیے۔ اس کے لیے پورے تعلیمی نظام کو مکمل طور پر تبدیل کرنا ہوگا۔ اول و آخر کی درجہ بندی چھوڑنی ہوگی۔ امتحانات کے طریقہ کار سے نجات پانا ہوگا۔ اس کی جگہ زندگی کی اس درجہ بندی کو متعارف کرانا ہوگا جس میں انفرادیت سے پاک محبت کی زندگی کی قبولیت ہو اور یہی زندگی کے فلسفے کا بلند مقام ہے۔ جس امتیاز کی امنگ کی جگہ محبت لے گی تو کامیابی کی جگہ سچائی آجائے گی جہاں کامیابی ہی زندگی کی قدر ہو وہاں سچائی نہیں ہو سکتی۔ کامیابی کو مرکزی اہمیت ملنے کے باعث سچائی کا خون ہو چکا ہے' نہیں کامیابی ہی زندگی نہیں ہے صرف کامیابی کے اندر ہی قدر نہیں ہے۔ یہ زیادہ اہم اور پر وقار ہوگا اگر کسی اچھی نیت اور کام سے ناکامیابی قبول کی جائے بجائے اس کے کہ کسی غلط کام اور چیز میں کامیاب ہوا جائے۔ محبت میں ناکامیاب رہنا اچھا ہے' مقابلے میں کامیاب ہونے سے' کیا مذہبیت میں ناکامیاب ہونا زیادہ بہتر نہیں ہے بجائے دولت کا ڈھیر لگانے میں کامیاب ہونے سے؟

مجھے زندگی کی کوئی قدر و قیمت صرف کامیاب ہونے میں نظر نہیں آتی۔ مجھے زندگی کی قدر سچائی میں' اچھائیوں میں' حسن میں دکھائی دیتی ہے لیکن جب تک پیمانہ صرف کامیابی ہوگا اس وقت تک انسانی روح سچائی' اچھائی اور خوب صورتی کی طرف نہیں بڑھ سکتی۔ سچائی' اچھائی اور خوب صورتی پھیلنی چاہیے، چاہے زندگی میں ناکامیابی ہی کیوں نہ ملے۔

ہمیں صرف اسی جانب دیکھنا چاہیے، ناکام ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ سچائی کی تلاش میں ناکام ہونا بھی فتح ہے کیونکہ آپ نے سچائی کے لیے شکست قبول کی ہے۔ اس طرح آپ کی روح توانا ہو کر اس قابل ہوئی ہے کہ آپ اس بلند و بالا چوٹی کو چھو لیں جو خدا کے نور سے چمک رہی ہے۔

فتح و شکست بے معنی چیزیں ہیں' معنی سامنے ہے' جس کے سامنے فتح یا شکست ہے۔ کیا یہ سامنا سچائی کا ہے یا پھر ناراستی کا۔ محبت یا نفرت کا انسان دوستی یا انسان دشمنی کا؟ میں کہتا ہوں کہ وہ خوش نصیب ہیں جو ناراستی کے راستے پر فتح چھوڑ دیتے ہیں اور سچائی کے راستے پر چل کر شکست کو گلے لگا لیتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ شکست کے باوجود فتح مند ہوتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے تابندہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن یہ سب کچھ صرف اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب تعلیمی نظام میں انقلاب برپا کیا جائے اور فتح و شکست میں قائم کی گئی درجہ بندی جو صدیوں سے انسان کو اذیت میں مبتلا کیے ہوئے ہے' ختم کر دی جائے۔

سچائی کے خلاف سب سے بڑا جرم تو وہ ہوتا ہے جب ہم اپنی روایتی سوچ کو اپنے بچوں پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں اس قسم کی کوشش انتہائی خطرناک ہے۔ روح اور خدا کے متعلق ایمان و یقین یا انکار کو بچوں کے ذہن میں ٹھونسا جاتا ہے۔ گیتا' کرشنا اور مہاویرا کو بچوں پر مسلط کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے کچھ جاننے کی تلاش و جستجو کا جذبہ ان میں نہیں پیدا ہوتا۔ وہ اپنے سوالات میں نکھار پیدا کرنے کی اہلیت کو ختم کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے سوالات کے جوابات اور مسائل کے حل کے متعلق سوچتے تک نہیں۔ پوری زندگی وہ ریڈی میڈ مسائل کو دہراتے رہتے ہیں۔ ان کی صورت طوطے جیسی ہو جاتی ہے' رٹی ہوئی بات سے کوئی انعکاس نہیں ہوتا۔ یہ ایک مشینی عمل ہوتا ہے۔ سچائی کسی دوسرے شخص سے نہیں وصول کی جاتی۔ اسے ہر شخص خود اپنے لیے تلاش کرتا ہے۔

کیا یہ مناسب نہیں کہ بچوں میں تجسس کی ہمت افزائی کی جائے' وہ ریڈی میڈ حل (مسائل کے حل) پر تکیہ نہ کریں؟ ان کی مدد کی جانی چاہیے کہ وہ سوالات پیدا کیا کریں اِدھر اُدھر سے مانگے ہوئے جوابات کے ڈھیر ان کے سامنے نہ لگائے جائیں اگر تعلیم صرف انہیں

زندگی کی سچائی کی تلاش پر لگا دے تو اس کا کام ختم ہو جائے گا۔

میرے خیال سے صرف استاد ہی بچوں کے ذہنوں میں سوئے ہوئے سوالات کو بیدار کرسکتا ہے وہی تجسس پیدا کرسکتا ہے وہی بچوں کو بے خوف اور باہمت بنا سکتا ہے تاکہ وہ خود اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ سکیں۔ ایک شخص اس قسم کا استاد اسی وقت بن سکتا ہے جب وہ خود تعصب اور جانبداری سے قطعاً پاک ہو۔

یہی وجہ ہے کہ استاد بننے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ وہ والہانہ وابستگی کا پختہ ارادہ کرے۔ ٹیچر بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی روح شعور وآگاہی، جہل کی بغاوت اور چوکسی سے بھر پور ہو۔ ایک ایسا ٹیچر جس میں جہل سے بغاوت کی آگ نہ روشن ہو وہ جانے یا انجانے طور پر مخصوص مفادات کا آلۂ کار ہو جاتا ہے۔ کچھ اخلاقی کچھ مذہبی یا کچھ سیاسی مفادات کا۔ اس قسم کا استاد بچوں تک وہی زہر منتقل کرتا ہے جس میں وہ یقین اور تعصب کے ناطے گرفتار کیا گیا تھا۔

اگر ایک استاد آزاد ہے تو ہی وہ اپنے طلباء کے لیے آزادی کا نقیب ہوسکتا ہے اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ایک ٹیچر ایک انتہائی عظیم شخص ہوتا ہے جس میں وابستگی اور پرہیزگاری بھری ہوتی ہے۔ وہ ایک عظیم انقلابی ہوتا ہے۔ استاد کے اندر غور وفکر استغراق اور انقلابی جذبات کی آگ روشن ہوتی ہے اسے بہت سی چیزوں کو ختم کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ دوسری پیدا کرسکے۔ وہ بہت سی چیزوں کو مٹا دیتا ہے تاکہ نئی پیدا کی جاسکیں۔ وہ نسل در نسل سے جمع شدہ کوڑے کباڑے کے ڈھیر پر آگ ڈال دیتا ہے، اس بے کار جھاڑ جھنکار اور گھاس کو کاٹ کر ذہنوں کے میدانوں کو صاف کر دیتا ہے تاکہ اس میں محبت اور خوب صورتی کے پھول کھل سکیں۔

یہ ایک انتہائی عظیم ذمہ داری ہے اگر استاد ان ضروریات کو پورا کرتا ہے تو ہی ایک نیا شخص، نئی انسانیت پیدا ہو سکے گی۔

محبت بھری تعلیم

مجھے خوشی ہے کہ میں نوجوانوں اور طلبا کی کامیابیوں پر گفتگو کر رہا ہوں، میرے ذہن میں نوجوانوں کے لیے جو پہلی چیز آ رہی ہے میں اسے آج ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہوں گا۔ پرانا ماضی جو اپنا وجود قائم کیے ہوئے ہے وہ پہلے ہی گزر چکا ہے لیکن پوری دنیا اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ بچے اس تصور کے ساتھ مستقبل کی خواہش رکھتے ہیں پرانے لوگ سوچتے اور ماضی کے لیے فکر مند ہیں۔ نوجوانوں کے لیے نہ تو ماضی ہے اور نہ مستقبل ان کے لیے صرف حال ہے۔ اگر آپ نوجوان ہیں اور آپ حقیقتاً ہیں تو حال میں صرف اپنی اہلیت کے ذریعے ہی رہ سکتے ہیں اگر آپ کے ذہن میں ماضی کے خیالات ہیں تو آپ نے بوڑھا ہونے کی شروعات کر دی ہیں اور اگر آپ کے تصور میں مستقبل موجود ہے تو آپ ابھی تک ایک بچہ ہیں۔

نوجوان توازن رکھنے کا ایک درمیانی نکتہ ہے جب ذہن کی ایسی کیفیت ہو جہاں نہ ماضی ہو اور نہ مستقبل جب ہم صحیح معنوں میں حال کے اندر رہ رہے ہیں تو ذہن جوان، تازہ اور زندہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز موجود نہیں ہے سوائے حال کے۔ ماضی اور مستقبل کا کوئی وجود ہی نہیں ہے صرف موجودہ لمحات ہی معروضی حقیقت کے طور پر موجود ہیں۔

ایسے کتنے لوگ ہیں جو موجودہ لمحات میں رہ رہے ہوں میرے خیال سے ایک ایسا شخص جو موجودہ حال میں رہتا ہے وہ نوجوان ہے۔ ایک ایسا شخص جس میں موجودہ حال میں رہنے کی اہلیت ہے وہ جوان ذہن ہے۔ یہ نہ تو بوڑھا ہے اور نہ بچہ لیکن حقیقتاً ہوتا کیا ہے یہ کہ لوگ بچپنے سے براہ راست بڑھاپے کی عمر میں چلے جاتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہیں جو نوجوانی (Youth) میں قدم رکھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص نوجوانی کے راستے آگے بڑھے۔ بہرحال ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جو سچ مچ نوجوانی میں داخل ہوتے ہیں وہ بوڑھے ہی نہیں ہوتے کیونکہ جو لوگ نوجوانی کی خفیہ باتوں سے واقف ہوتے ہیں انہیں بوڑھا ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی، جسم ضرور بوڑھا ہوتا ہے عمر بڑھتی رہتی ہے لیکن ذہن مسلسل جوان اور تیز رہتا ہے۔

چنانچہ میں آپ سے کہوں گا کہ آپ خود کو اس لیے جوان نہ سمجھیں کہ آپ کی عمر ایک بچے

اور بڑھاپے کے درمیان ہے آپ محض عمر کی بنا پر نوجوان نہیں ہو سکتے نوجوان ہونا انتہائی اہم امر ہے۔ میں اس بارے میں آپ سے چند باتیں کہوں گا۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ آپ لوگ طالب علم ہیں میں ایسا نہیں سمجھتا کیونکہ اگر دنیا میں طالب علم ہوتے تو یہاں بہت زیادہ علم ہوتا۔ طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن علم نہیں بڑھ رہا ہے اس کی جگہ جہالت بڑھتی جا رہی ہے' طلبا بڑھ رہے ہیں' یونیورسٹیاں بڑھ رہی ہیں لیکن دنیا بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اگر علم بڑھ رہا ہوتا تو دنیا بہت بہتر ہوتی۔

میرے لیے یہ ایک خوش گوار حیرت ہوگی اگر مجھے کوئی باغ میں لے جائے اور کہے "میں نے پھولوں کے چند پودے لگائے تھے جو بار آور ہوئے' پھول کھلنے لگے ہیں لیکن اس کے ساتھ ناگوار بو بھی بڑھتی جا رہی ہے' بجائے خوشبو کے۔" پھر میں سوال کروں گا "ناگوار بو کے ساتھ یہ پھول اور پودے بار آور کیسے ہوئے؟"

یونیورسٹیوں اور کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے میرے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ دنیا میں ہر ہفتے پانچ ہزار کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ کتاب اور طلبا کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے' تعلیم بڑھ رہی ہے لیکن دنیا بدتر ہو رہی ہے۔ اس دنیا میں اگر جنگ زیادہ تشدد برپا کر رہی ہے' بے زاری و بغض پھیل رہا ہے' نفرت اور حسد بڑھ رہی ہے تو کوئی نہ کوئی بنیادی غلطی ضرور ہے۔ ایسی صورت حال میں ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو تعلیم سے منسلک ہیں۔ اساتذہ اور طلبا۔

پچھلے پانچ ہزار برسوں میں بہت سے انقلابات آئے' معاشی اور سیاسی انقلابات' لیکن ابھی تعلیم میں کوئی بنیادی انقلاب برپا نہیں ہوا۔ یہاں ایک سوال سر اٹھاتا ہے کہ کیا انسان کی معاشرت میں تعلیمی انقلاب کے بغیر کوئی انقلاب آ سکتا ہے یہ ممکن نہیں کیونکہ تعلیم آپ کے ذہن میں ایک ایسا ڈھانچہ تعمیر کرتی ہے جس کے باعث قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے کہ آپ آزاد رہیں۔ ایک طالب علم پندرہ بیس برس تک تعلیم حاصل کرتا ہے اس عرصہ کے دوران اس کا ذہن پختہ ہو چکا ہوتا ہے اس کے بعد انتہائی دشوار ہوتا ہے کہ اس ڈھانچے میں تبدیلی لائی جائے تاوقتیکہ وہ شخص مہم جو اور باہمت نہ ہو۔

کیا اس ڈھانچے میں کوئی خرابی ہے جو ہمیں تعلیم سے نوازتا ہے؟ سچ یہی ہے کہ اس میں

کوئی خرابی ضرور ہے کیونکہ اس سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ غلط ہے اور یہ حاصل ہونے والے نتائج ہی ہوتے ہیں جس سے صحیح اور غلط کا اندازہ لگایا جاتا ہے جو بچے پڑھ لکھ کر نکلتے ہیں وہ نسل انسانی کے لیے بدی ثابت ہوتے ہیں۔

میں آپ سے یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ قدیم تعلیمی نظام بہتر تھا اور ہمیں اسی طرف بڑھ جانا چاہیے۔ وہ سب کے سب بے معنی' احمقانہ اور فضول ہیں۔ زندگی میں پیچھے کی طرف نہیں لوٹا جاتا۔ ماضی میں بھی تعلیمی نظام بنیادی طور پر ٹھیک نہیں تھا۔ اگر وہ صحیح ہوتا تو موجودہ غلط نظام جنم نہ لیتا۔ وہ ماضی میں غلط تھا اس لیے اب بھی غلط ہے' غلط سے غلط ہی جنم لیتا ہے۔

میں آپ سے کہوں گا کہ اصل غلطی کہاں تھی۔

وہ مرکز جس کے گرد تعلیم گھومتی ہے وہی غلط ہے۔

ساری خرابیاں سارے مسئلے اسی غلط مرکز کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں وہ کامیابی حاصل کرنے کی امنگ (AMBITION) ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام اسی امنگ کے گرد گھوم رہا ہے' ہمیں کیا پڑھایا جاتا ہے؟ ہمیں امنگ کا سبق پڑھایا جاتا ہے ہمیں پڑھایا جاتا ہے کہ دوڑ میں سب سے آگے نکلیں۔ یہاں تک کہ کنڈر گارڈن کے ایک بچے کو بھی اسی خواہش کا سبق دیا جاتا ہے کہ وہ کلاس میں فرسٹ آئے۔ اس سے زیادہ تشویشناک خواہش دنیا میں کوئی دوسری نہیں۔ صرف یہی ایک خواہش کہ دوسروں سے آگے کس طرح نکل سکتے ہیں' سب لوگوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے۔

اسکول جانے والے چھوٹے بچے کو یہی فکر کھائے جاتی ہے اگر وہ اول آ گیا تو اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا اور اگر دوسرے نمبر پر آیا تو اس کی توہین ہوگی اور اگر فیل ہو گیا تو ذلیل و خوار ہوگا اگر کامیاب ہوا تو ٹیچرز اور والدین عزت کریں گے انعام دیں گے۔ ہم بچوں کے اندر مقابلے کا زہر بھر رہے ہیں' بخار کی ایک قسم کو مقابلہ کہتے ہیں جب آپ کو بخار ہو تو انرجی بڑھ جاتی ہے' آپ بہت تیز دوڑ سکتے ہیں۔ آپ بری زبان کا تیزی سے استعمال کر سکتے ہیں' آپ وہ بھی کر سکتے ہیں جو عام حالات میں کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے یعنی بخار کی صورت میں کسی کام کے لیے شدت اور رفتار بڑھ جاتی ہے۔

ہمارا پورا نظامِ تعلیم اسی بخار کو پیدا کرنے کے لیے وجود میں آیا ہے کہ سب کو پیچھے چھوڑ کر

آ گے نکل جاؤ' بچوں کی انا میں اضافہ کر دیا گیا ہے ان کی بس یہی خواہش رہ گئی ہے کہ وہ کسی بھی طرح اول آ جائیں۔ وہ سخت محنت کرتے ہیں' اپنی پوری طاقت کے ساتھ لیکن کس مقصد کے لیے؟ صرف اس لیے کہ مقابلے میں اول آ جائیں' مقابلے کا بخار یہ رجحان بچوں کے ذہنوں میں بیٹھ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ تعلیمی میدان کو خیر باد کر دیتے ہیں لیکن بخار اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔

وہ چاہتے ہیں کہ ایک بہت بڑا گھر تعمیر کریں ایک بہت بڑی دکان ہو' ایک بڑی حیثیت حاصل کر لیں وہ اگر جونیئر کلرک ہیں تو ہیڈ کلرک بننے کی خواہش ہوتی ہے اگر ماسٹر ہیں تو ہیڈ ماسٹر ہونا چاہتے ہیں۔ ڈپٹی منسٹر سے منسٹر' کچھ لوگ ملک کا صدر بننا چاہتے ہیں یا کچھ اور۔ دیوانگی کی یہ دوڑ پوری زندگی جاری و ساری رہتی ہے۔ اس پاگل پن کی دوڑ میں ان کا سکون' انرجی اور اہلیت سب ہی ضائع ہو جاتی ہے۔

آخر میں انہیں ملتا کیا ہے؟ آخر میں وہ کہیں بھی نہیں پہنچتے جہاں پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان سے آگے کوئی دوسرا موجود ہے اور اس وقت تک جو تک کہ کوئی آگے ہے' اسے سکون نہیں مل پاتا۔ دنیا میں آج تک کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جب سب سے آگے نکل جانے کا دعویٰ کرے۔ اس کے آگے ہمیشہ کوئی نہ کوئی موجود ہوتا ہے۔ دنیا بہت بڑی ہے اور ہم ایک دائرے میں کھڑے ہوئے ہیں' دائرے میں کون آگے اور کون پیچھے ہوتا ہے؟ ہر شخص ایک دوسرے سے آگے ہوتا ہے پھر یہ دوڑ جاری رہتی ہے' آگے اور آگے اور آگے۔ دنیا میں ابھی تک کوئی شخص ہر ایک سے آگے نہیں پہنچ پایا لیکن ہم ابھی تک بچوں کو یہی پڑھا رہے ہیں کہ اول آؤ' ہم دیوانہ پن پڑھا رہے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ دوڑتے رہیں گے اور ضائع کر دیں گے۔

ہمارے پورے تعلیمی نظام کی بنیاد نفرت اور حسد پر رکھی گئی ہے' ہم لوگوں سے کہتے جا رہے ہیں "حسد' تشدد اور نفرت نہ کرو" لیکن پوری تعلیم کی جڑیں نفرت پر ہیں۔ ہم ایک بچے کی طرف اشارہ کرتے اور دوسرے سے کہتے ہیں "دیکھو وہ کتنا ذہین ہے اور تم کتنے گودم ہو" اس طرح ہم حسد اور نفرت پھیلا رہے ہیں۔ ہم اس بچے کے ذہن میں کیا چیز پیدا کر رہے ہیں؟ اس کے ذہن میں حسد کا زہر بھر رہے ہیں۔ اس بچے سے محبت نہیں کر رہے۔ یہ زہر اس

کی رگوں' اس کے ذہن میں دوڑتا پھرے گا اس کی پوری زندگی میں۔ بچہ ہمیشہ ہر شخص سے آگے جانا چاہے گا' یہ ایک تمسخر ہے کیونکہ آج تک کوئی بھی سب سے آگے نہیں گیا اور آگے جانے میں کوئی لطف بھی تو نہیں۔ کسی سے آگے جانے میں کون سی خوشی ہے؟ کسی سے آگے جانے میں کون سا سکون ہے؟ نہیں' اس تعلیم کی بنیاد ہی غلط ہے۔

یہ امتیاز اور امنگ اور تعلیمی نظام اسی مرکز کے گرد گھوم رہا ہے جسے کامیابی کی امنگ کہتے ہیں اگر ہم ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس مرکز کو کسی دوسرے مرکز سے تبدیل کرنا ہوگا۔

وہ نیا مرکز کیا ہو سکتا ہے؟

تو میں آپ سے کہنا چاہوں گا کہ مقابلہ اور مسابقت کو تعلیمی مرکز نہیں ہونا چاہیے' تعلیمی مرکز محبت ہونا چاہیے۔

محبت سے میری مراد کیا ہے؟ اگر میں موسیقی سیکھنی چاہتا ہوں اور ہم بہت سے لوگ یہاں موجود ہیں اور ہم موسیقی سیکھنے کی جدوجہد میں کوشش کرتے ہیں کہ فن موسیقی میں کوئی ہم سے آگے نہ نکلنے پائے تو کیا ہم اس قسم کے دباؤ اور بخار میں موسیقی سیکھ سکتے ہیں؟ اگر ہم سب سے آگے رہنے کی دوڑ میں گر جاتے ہیں تا کہ کوئی ہماری بے عزتی نہ کر سکے اور یہ نہ کہے کہ ہماری کوئی حیثیت نہیں تو کیا ہم موسیقی سیکھ سکتے ہیں؟ کیا یہ موسیقی سے محبت ہوگی یا انا پرستی؟ جہاں انا سے محبت ہوگی وہاں موسیقی نہیں سیکھی جا سکتی۔ کیا ہم انا سے محبت کے ساتھ موسیقی سیکھ سکتے ہیں؟

کچھ سیکھنے کے لیے عاجزی اور انکسار کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ ہمارا تعلیمی نظام انا پرستی کا درس دیتا ہے' عاجزی و انکسار کا نہیں۔ اساتذہ خود ناخوش ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ طلبا میں عاجزی و انکساری کا فقدان ہے۔ آخر ٹیچرز عاجزی کی توقع کیونکر کرتے ہیں؟ جب ہم طلبا کو پڑھا رہے ہوں کہ ہر شخص سے آگے رہو' اس طرح تو ہم انہیں انا پرستی کا درس دیتے ہیں پھر انہیں عاجزی یا انکسار کس طرح آ سکتا ہے؟ ایسی توقع رکھنا خام خیالی ہے' جب وہ سب سے آگے کھڑے ہوں گے تو ان کا عجز تباہ ہو جائے گا اور وہ مکمل انا بن چکے ہوں گے جو لوگ انا میں گرفتار ہوں گے تو وہ موسیقی نہیں سیکھ سکیں گے بلکہ کوئی چیز بھی نہیں۔

کچھ سیکھنے کے لیے عجز وانکسار کی ضرورت ہوتی ہے' سیکھنے کے لیے انا سے پاک بے غرضی درکار ہوتی ہے لیکن ہم انا سے پاک بے غرضی سکھاتے ہی نہیں۔ ہم ہیں کہ ان سے کہتے ہیں ''تمہیں اول آ کر یونیورسٹی کا گولڈ میڈل لینا ہے' تمہیں بھارت رتنا لینا ہے'' اونچے اعزازات ہندوستانی صدر عطا کرتے ہیں۔ تمہیں صدر بننا ہے' تمہیں یہ اور وہ بننا ہے'' ان کے ذہنوں میں حسد کی آگ بھری جاتی ہے۔ ان کی انا پرستی میں اضافہ کیا جاتا ہے پھر وہ موسیقی کیسے سیکھ سکتے ہیں؟ وہ علم ریاضی کیسے سیکھ سکتے ہیں؟ وہ زندگی کی ضروریات کے بارے میں کچھ کیسے سیکھ سکتے ہیں؟ کچھ سیکھنے کے لیے' ایک غیر انا پرست' مقابلے کے جذبات سے پاک ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہاں موسیقی سیکھنے کی دوسری بنیاد بھی ہے اور وہ موسیقی سے محبت ہے۔ موسیقی جاننے والوں سے مقابلہ نہیں' نہ ساتھی طلبا سے مسابقت ہے۔ صرف اور صرف محبت اور اخلاص ہے اس سبجیکٹ سے جسے وہ سیکھنا چاہتا ہے یہ اچھا ہوگا اگر ہم ریاضی کے ساتھ محبت کی تعلیم دیا کریں بجائے دوسرے ساتھیوں سے مقابلے کے۔ اچھا ہوگا اگر ہم موسیقی سے محبت سکھائیں بجائے دوسرے سے مقابلہ کرنے کے جو موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اگر موسیقی سے محبت ہوگی تو موسیقی سیکھی جا سکتی ہے۔ ہم وہ تمام چیزیں سیکھ سکتے ہیں جس سے ہمیں محبت ہے گویا محبت ہی ہے جس سے ہم کچھ سیکھ سکتے ہیں لیکن ہم تو پڑھاتے ہی نہیں کہ محبت کس کو کہتے ہیں۔ ہماری تعلیم میں محبت کا عمل دخل ناموجود ہے۔

چنانچہ ہوتا کیا ہے اگر آپ یونیورسٹی میں ادب (لٹریچر) کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو یونیورسٹی سے آنے کے بعد آپ ادب کا مطالعہ نہ کریں کیونکہ وہ آپ کو دشمنی سکھاتا ہے اور آپ کافی بور بھی ہو جائیں گے اگر یونیورسٹی میں آپ نے نظم کی تعلیم حاصل کی ہے تو زندگی میں نظم (POETRY) کا لطف تو پہلے ہی تباہ ہو چکا۔ اس کی تباہی کی وجہ یہ ہے کہ وہ انا کی دوڑ میں مطالعہ ہوئی' اس لیے پڑھی گئی کہ امتحان پاس کر کے پہلی پوزیشن حاصل کی جائے در حقیقت نظم سے محبت تو سکھائی ہی نہیں گئی۔ اس لیے سچ پوچھیں تو تعلیم ہماری ذہنی اور تخلیقی صلاحیت تباہ کر رہی ہے۔

ایک بار EMERSON سے کہا گیا کہ وہ قصبے کے واحد گریجویٹ کی سیاسی تقریب

میں شریک ہو اور اس گریجویٹ کے لیے چند کلمات بھی کہے۔ ایمرسن نے جواب دیا ''ٹھیک ہے پہلے مجھے اس جوان کی اہلیت کا اندازہ لگا لینے دو اس کے بعد ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔'' ایک ماہ بعد اس نے تقریب میں شرکت کی اور حاضرین سے کہا'' مجھے لڑکا پسند ہے' میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں؟ میں ایسا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنی ذہانت اور صلاحیت کو بچائے رکھنے میں کامیاب رہا۔''

تعلیم کی صورت کچھ ایسی ہی ہے' وہ لوگ واقعی قابلِ قدر ہوتے ہیں جو یونیورسٹی کی الجھا دینے والی تعلیم سے فراغت کے بعد وہاں سے اس طرح نکلتے ہیں کہ اپنی صلاحیتوں کو بچائے رکھیں' عام طور پر وہ تباہ ہو چکی ہوتی ہیں۔

تعلیمی نظام کا پورا ڈھانچہ اور اس کی بنیاد غلط ہے۔ وہ تعلیم صرف اور صرف مقابلہ' رقابت اور انا پرستی کے گرد گھومتی ہے اس طرح قدرتی طور پر وہ دنیا کو انا پرستی' لڑائی' جنگ اور باہمی مخالفت سے بھر دیتی ہے۔ یہ بچے کل بڑے ہو کر لڑیں گے۔ وہ گروہ سے لڑیں گے' سوسائٹی سے جنگ کریں گے' مذہب اور مسلک کے لیے یا ایک قوم کی حیثیت میں کیونکہ انہیں تو سب سے آگے رہنا ہے وہ اپنے ملک کے لیے جنگ کریں گے۔

دنیا کے تمام ممالک جنگ کر رہے ہیں وہ کیوں لڑ رہے ہیں کیونکہ بچوں کو صرف لڑائی سکھائی گئی ہے کچھ اور نہیں۔ انہیں محبت نہیں سکھائی گئی' انہیں نفرت اور حسد کی تعلیم دی گئی ہے ابھی جلد ہی بڑی جنگیں ہو چکی ہیں جس میں ایک سو ملین لوگ مارے گئے۔ تعلیمی نظام میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور ہے یہ کس قسم کی تعلیم ہے کہ پانچ سے دس برسوں میں لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے؟ یونیورسٹی سے کس قسم کے طلبا باہر آتے ہیں؟ ان کے ذہنوں میں کون سا روگ پیدا ہو گیا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں جنگیں لڑی جا رہی ہوں اور یونیورسٹیاں بھی پھل پھول رہی ہوں؟

اگر تعلیم حقیقی ہو' یونیورسٹیاں صحیح ہوں تو پوری دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کوئی جنگ نہیں ہوگی کیونکہ کوئی پڑھا لکھا آدمی جنگ کس طرح کر سکتا ہے؟ کیا مہذب معاشرے کے لوگ لڑ سکتے ہیں؟ کیا وہ قتل کر سکتے ہیں؟ ایک دو آدمی نہیں بلکہ کروڑوں لوگ؟ لیکن ہم یہی کچھ کر رہے ہیں' کیا ایک پڑھا لکھا آدمی لڑے گا اور جنگ پر جائے گا۔ وہ تو جنگ کی حکمت عملی سمجھ

ہی نہیں سکتا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب جنگ ہورہی ہوتو لوگوں کو بڑی خوشی ہوتی ہے یہ یقیناً ایک بیمار ذہن کی غمازی کرتا ہے جب جنگ ہورہی ہوتو لوگوں کے چہرے ہشاش بشاش ہوتے ہیں۔لوگ خوش ہوتے ہیں اگر ہندوستان پاکستان کی جنگ ہورہی ہو یا ہندوستان اور چین کی جنگ ہورہی ہو یا پھر یہ بے وقوفی کسی کے بھی درمیان ہورہی ہو، لوگ کس قدر خوش ہوتے ہیں، انہیں رات اور دن میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ صبح ہی صبح وہ اخبارات کا مطالعہ شروع کردیتے ہیں، خبریں سنتے ہیں اور اس پر گفتگو کرتے ہیں، ذرا ان کے چہرے کو دیکھیں ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بڑی ہی خوشی کی بات ہوئی ہے لوگ لڑائی کے لیے تیار کیے گئے ہیں اس کے علاوہ ان کی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، چوبیس گھنٹے جنگ۔

جب راستے میں کہیں دو آدمی لڑ رہے ہوں تو سینکڑوں لوگ ایک مجمع کی شکل میں کھڑے لڑائی دیکھ رہے ہوں گے، بہت سے ضروری امور کو ایک طرف رکھ دیں گے۔ کیا دیوانگی ہے دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے دیکھنا ایک خاص ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ یہ کسی مہذب معاشرے کا ذہن نہیں ہوسکتا۔ دو اشخاص کو لڑتے ہوئے دیکھنا ایک گھناؤنے ذہن کا کام ہے لیکن پوری دنیا کے لوگ یہی کرتے ہیں یہ بات ہر ملک کے لیے صادق آتی ہے، ہمارا ذہن اسی لیے تیار کیا گیا ہے۔

دو کی لڑائی میں جب ایک شخص فتح مند ہوتا ہے تو ہم اس کے گلے میں ہار پھول ڈالتے ہیں اور جس نے شکست کھائی اس پر ہنستے ہیں۔ اس سے گمراہ ذہن کی عکاسی ہوتی ہے اس پر تشدد اور بیمار ذہن ہونے کا پتہ چلتا ہے جس کے گلے میں ہار پھول ہوتا ہے وہ عظیم شخص ہے اور جو ہار گیا وہ بے توقیر؟ کیا آپ بیماری میں مبتلا اس ذہن کو نہیں دیکھتے؟ کیا ہار جانے والے سے ہمدردی اور محبت ہوتی ہے یا نہیں؟ کیا ہم جیتنے والے کے لیے مجسم احترام نہیں بن جاتے؟

اگر تعلیم صحیح ہوتی تو ہارنے والے سے محبت اور یگانگت ضرور پیدا ہوتی۔ ایک ایسے شخص کو جو فتح پانے کی تمنا کرتا اسے لوگ حیرت سے دیکھتے کہ وہ کسی دوسرے کو شکست دینا چاہتا ہے۔ اس شخص کا رویہ کتنا تشدد آمیز ہے۔ کسی کو شکست دینا متشدد رویہ ہے۔ کسی کو شکست سے دوچار کرنا قابل نفرت ہے، کسی کو شکست دینے کی کوشش گمراہ ذہن کا ثبوت ہے، ایک بیمار ذہن کا

ثبوت لیکن ہمیشہ جیتنے والے کی ہم عزت کرتے ہیں اور ہارنے والے کو بے توقیر گردانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ ہم اپنے لیے بھی فتح مندی چاہتے ہیں۔ ہم جیتنے والے کے حمایتی ہوتے ہیں کیونکہ ہم خود بھی فتح کے آرزومند ہیں، ہمارے اپنے ذہن میں بھی جیتنے کے جذبات بھرے ہوئے ہیں۔ ہم کسی دوسرے شخص کے سینے پر بیٹھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں چنانچہ کامیاب ہونے والے کو ہار پہناتے ہیں اور گرنے والے کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ ہارے ہوئے شخص کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے۔

سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ ہمارے اندر انا پرستی کیوں ہے، اس دیوانگی کی دوڑ کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ جس میں جتنا احساس کمتری ہے، اس میں اتنی ہی انا پرستی ہے۔ آپ میں احساس کمتری کا جتنا احساس ہوگا اتنا ہی آپ خود کو کمتر سمجھیں گے اور اتنا ہی پُرعزم اور پُرامنگ ہوں گے، کیوں؟ امنگ اور ارادوں سے آپ اپنی آنکھوں اور دنیا کی آنکھوں میں یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ آپ پرعزم ہیں اور آپ کو کوئی شخص کمتر سمجھنے کی کوشش نہ کرے۔

میں ایک چھوٹی سی حکایت بیان کروں گا جس سے آپ کو یہ سمجھنے میں مدد ملے گی۔ آپ نے تیمور لنگ (TEMERLANE) کا نام سن رکھا ہوگا اس نے جنگ لڑی اور ایک چھوٹے سے ملک کو شکست دیدی۔ اس ملک کے بادشاہ کا نام بے جال (BAIJAL) تھا اسے گرفتار کرنے کے بعد تیمور لنگ کے سامنے پیش کیا گیا اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ شکست خوردہ، بے جال تیمور لنگ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ تیمور لنگ تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے مشیر اور فوجی وغیرہ کھڑے ہوئے تھے۔

تیمور لنگ ہنسنے لگا، قدرتی بات تھی کہ بے جال کو غصہ آگیا اس میں شک نہیں کہ وہ شکست خوردہ تھا لیکن تھا تو بادشاہ اس نے پُروقار انداز میں سر اٹھایا اور کہا ”تیمور لنگ بے وقوفی نہ کرو، وہ جو دوسروں پر ہنستے ہیں کسی دن وہ خود بھی شکست کے ہاتھوں روتے ہیں“

اگر میں وہاں موجود ہوتا تو تیمور لنگ سے کہتا کہ بادشاہت کوئی نہیں چاہتا سوائے لنگڑے اور اندھے کے۔ کوئی عقل مند شخص بادشاہ نہیں بننا پسند کرتا کوئی سمجھ دار آدمی سیاستداں بننا بھی نہیں چاہتا، کوئی عقل و خرد والا نہیں چاہتا کہ وہ کسی دوسرے کے سینے پر بیٹھے۔ کوئی دانا آدمی کسی کو اپنے پیروں تلے دبا کر اس کا مالک بننا پسند نہیں کرتا۔ یہ تمام چیزیں بیمار ذہن اور احساس

کمتری والے شخص کی خواہش ہیں جو کسی شخص کے اندر بیٹھا ہوتا ہے۔

ہمارے اندر موجود احساس کمتری اور کمزوریاں' لنگ اور نابینگی چھپی رہنا چاہتی ہیں ہم انہیں چھپائے رہتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ پوری دنیا غلط ہے اور یہ کہ ہم بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ہم نے اپنی طاقت کا ثبوت فراہم کردیا اور کوشش کررہے ہیں کہ دوسروں کو بھی یقین دلادیں کہ ہم کمزور اور حاجت مند نہیں ہیں۔ یہ پست ذہنیت کی دوڑ ہے۔

تعلیمی نظام کی بنیاد کی جڑوں کو دیکھیں تو اس کا انحصار پر تشدد روئے پر ہے کامیابیوں کی امنگ شخصیت کے وقار کا سبب نہیں ہوتی بلکہ یہ تو شخصیت کی احساس کمتری کی غمازی ہے۔ دنیا کا ہر شخص کسی نادیدہ شخصیت سے خوف زدہ ہے ہر شخص نام ونمود چاہتا ہے' وی آئی پی بننا چاہتا ہے' ہر شخص بلند حیثیت کا خواہاں ہے' اچھی شہرت اور اپنا ایک گھر۔ یہ دیوانہ پن کون پیدا کررہا ہے؟ یہ ہمارا تعلیمی نظام پیدا کررہا ہے۔

تعلیم وہ اچھی ہوگی جو سکھائے کہ تم جیسے بھی ہو' کافی ہو۔ ہمیں تم سے کچھ اور نہیں چاہیے بس تم جیسے بھی ہو وہ کافی ہے' اپنے امکانات اور تجربات سے لطف اٹھاؤ۔ کسی کے پیچھے نہ دوڑو' یہ ضروری نہیں ہے اس کی کوئی وجہ نہیں۔

اگر تعلیم ہر شخص کو یہ بتائے کہ ایک شخص جیسا بھی ہے خوب ہے اور اسے تجربے سے گزرنے دے اور خوشیوں سے ہمکنار ہونے دے اگر تعلیم پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرے پھلنے پھولنے کا موقع' کامیابی حاصل کرنے کی امنگ نہیں۔ محبت کے مواقع' مقابلے کے نہیں' خود بیداری اور شعور کے مواقع' دوسروں سے مخالفت نہیں۔ اس کے بعد ہی دنیا میں تعلیم انقلاب برپا کرسکتی ہے۔ جب تک تعلیم ایسا نہیں کرتی تو وہ انسان کے مفاد میں نہیں ہوگا بلکہ انسان کی تکلیف کا باعث ہوگا۔ ایسی تعلیم انسان کے ذہن کو زہر آلود کررہی ہے۔

ہم جیسے بھی ہیں ٹھیک ہیں' کسی میں کسی چیز کی کمی ہے؟ اگر انسان پرعزم نہیں بنتا تو دنیا میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی۔ اگر انسان کامیابیوں کی امنگ میں پاگل نہ بنتا تو اس کے پاس ہر چیز ہوتی ہے لیکن انسان میں وہ دیکھنے کی اہلیت کا فقدان ہے۔ وہ کس طرح دیکھ سکتا ہے؟ ہماری نگاہیں تو دوسروں پر لگی رہتی ہیں کہ ان کے پاس کیا ہے جو لوگ کامیابیوں کی امنگ کے اسیر ہوتے ہیں ان کی نگاہیں ہمیشہ دوسروں کی چیزوں پر ہوتی ہیں وہ یہ نہیں دیکھ پاتا کہ اس کے

پاس کیا چیز ہے کتنی دلچسپ بات ہے کہ اگر کل ایک شخص کو وہ تمام چیزیں مل جائیں تو وہ حاصل شدہ چیزوں پر نظر رکھنا بند کردے گا اور دوبارہ دیکھنا شروع کردے گا کہ دوسروں کے پاس کیا ہے۔

ذرا دیکھئے اور سوچئے کہ یہ درست ہے یا نہیں' آپ کے پاس دو آنکھیں' دو ہاتھ' دو پیر ہیں اور آپ سانس لے رہے ہیں' آپ کا ایک جسم ہے' یہ سب چیزیں بجائے خود ایک بڑا اثاثہ ہیں۔ جس کے ذریعے آپ بہت ساری عظیم اشیا پیدا کرسکتے ہیں۔

ایک بادشاہ تھا وہ سخت پریشان اور بے چین رہا کرتا تھا' یہاں تک کہ اس نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھا اور جنگل کی جانب روانہ ہوگیا وہاں اس نے دیکھا کہ گڈریا اپنی بانسری بجارہا ہے اور قریب ہی بھیڑیں چر رہی ہیں۔ اس کی بانسری کی لے میں کچھ ایسا جادو تھا کہ بادشاہ نے اپنا گھوڑا روک دیا اور جوان لڑکے سے کہا ''تم دنیا و مافیہا سے بے خبر' لطف و سرور کے ساتھ اس طرح بانسری بجارہے ہو جیسے تمہیں بادشاہت مل گئی ہو۔''

اس جوان نے جواب دیا ''برائے کرم خدا سے دعا کرو کہ میرے جتنے بھی گناہ ہوں وہ مجھے بادشاہت نہ دے۔''

بادشاہ نے جواب دیا ''تم پاگل ہو' تم بادشاہت سے کیوں خوف زدہ ہو؟''

جوان نے جواب دیا ''جس انسان کے پاس بادشاہت نہ ہو تو وہ شخص بادشاہ ہوتا ہے لیکن جب اسے بادشاہت مل جاتی ہے تو وہ اسی وقت سے ایک غلام بن جاتا ہے۔''

جب تک کوئی شخص بادشاہ نہیں بنتا وہ سچ مچ بادشاہ ہوتا ہے' بہت سے ایسے لوگ جو کچھ نہیں ہوتے' وہ بادشاہ ہوں جیسے ہوتے ہیں جس کے لطف و مسرت کی کوئی حد نہیں ہوتی' انہوں نے ہی موسیقی ترتیب دی ہے جو ہزاروں برسوں سے سنی جارہی ہے۔ دنیا نے آج تک کسی ایسی موسیقی کے متعلق نہیں سنا جسے کسی بادشاہ نے ترتیب دی ہو۔ اس کا لباس چمکتا دمکتا رہتا ہے لیکن اس کا قلب گرد آلود ہوتا ہے اس کا تاج تو تاباں ہوتا ہے لیکن دماغ میں روشنی کی کرن تک نہیں ہوتی اور نہ کبھی ہوسکتی ہی اس کی انتخاب کی ہوئی چیزیں گواہی دیتی ہیں کہ اس کے اندر روشنی کی رمق تک نہیں اگر اس کے اندر روشنی ہوتی تو وہ اپنے سر کو سونے سے کبھی نہ سجاتا۔

وہ شخص جس کا دماغ سنہرا ہو وہ اپنے سر پر سونے کا تاج کبھی نہیں پہنتا۔ وہ دیوانہ ہی ہوگا

جواس کے گرد پتھر (ہیرے جواہرات) جڑواتا ہے؟ وہ جن کا سر سونے کا نہیں ہوتا ہے وہ اپنے سر کو فضولیات سے بھر لیتے ہیں اور سونے کا تاج ان فضولیات کو چھپا لیتا ہے۔

چنانچہ جوان شخص نے کہا "مجھے معاف کیجیے اور دعا کیجیے کہ پروردگار مجھے کبھی بادشاہ نہ بنائے" بادشاہ الجھن میں پڑ گیا اور بولا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا لباس پھٹا پرانا ہے اور تم بھیڑوں کو چرانے کا کام کرتے ہو' آخر تمہاری خوشیوں کا راز کیا ہے؟"

جوان نے بادشاہ سے کہا "خوشیوں کے راز کا تعلق اس بات سے نہیں ہوتا کہ آپ کے پاس کیا ہے بلکہ اس بات سے ہے کہ جو کچھ آپ کے پاس ہے اسے آپ کس طرح استعمال کر رہے ہیں۔" اس نے مزید کہا "میرے پاس آنکھیں ہیں' میں قدرتی مناظر اور اس کے حسن کو دیکھتا ہوں اور خوش ہو جاتا ہوں۔ میرے پاس بھیڑیں ہیں میں ان سے محبت کرتا ہوں اور میرا دل خوشیوں سے لبریز رہتا ہے میرے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ میں صحت مند ہاتھوں اور پیروں کا مالک ہوں' میں اپنے لیے روٹی پانی کا انتظام کرتا ہوں۔ دن رات میں چاند ستاروں جنگل اور پہاڑیوں کے قریب رہتا ہوں۔ میرے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ ہاں میرے پاس ایک چیز کی کمی ضرور ہے اور وہ بادشاہوں کی بے چینی اور فکر ہے' میں رات میں گہری نیند سوتا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا "تم نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے' شہر میں واپس جاؤ اور لوگوں سے کہو کہ تم نے خوشیوں کے متعلق جو باتیں مجھ سے کی ہیں وہ صحیح ہیں۔ ان سے یہ بھی کہنا کہ میں جنگل میں خود کشی کرنے کی غرض سے آیا تھا میں خدا سے دعا گو ہوں کہ وہ تمہیں کبھی سلطنت کا مالک نہ بنائے۔"

میں یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ کبھی کوئی سلطنت کی خواہش تک نہ کرے' بادشاہت کی تمنا کرنا ایک مہلک بیماری ہے اس کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے لیکن ہم سب بادشاہت لینے کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کیا بننا چاہتے ہیں آپ جب تک کچھ بننے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں آپ بادشاہت ہی کی دوڑ میں شامل ہیں۔ ممکن ہے وہ کوئی انتہائی چھوٹی سلطنت ہی کیوں نہ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بنیادی بات یہ ہے کہ آپ ان چیزوں کا ادراک کریں جو آپ کے پاس ہے اور اس سے

لطف لیں اور اس کی اہمیت کو محبت سے تسلیم کریں اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ کی زندگی خوشیوں سے بھر جائے گی اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم اپنے پاس موجود چیزوں کا استعمال کس طرح کر رہے ہیں' جیسا کہ گڈریے نے کہا تھا۔

میں آپ کو ایک دوسری کہانی سناتا ہوں جاپان میں دو راہب رہا کرتے تھے یہ موسم برسات کا زمانہ تھا' بارشیں شروع ہو چکی تھیں ایک شام جب وہ واپس گھر آئے تو دیکھا کہ ان کی آدھی جھونپڑی تباہ ہو چکی ہے۔ ہواؤں نے چھت اڑا دی تھی دونوں راہبوں میں سے ایک خدا سے سخت ناراض تھا' اس نے شکوہ کیا۔

"شدید بارشوں کا زمانہ شروع ہوا' بادل چھائے اور ہماری آدھی جھونپڑی کو تباہ کر دیا' اب ہمارا کیا بنے گا؟ ہم کہاں رہیں گے؟" اسی دوران خدا کی موجودگی کا شک ابھرا' گناہ گار لوگوں کے بڑے بڑے محلات قائم رہے لیکن خدا نے ان کے محلات کو اڑانے کا سوچا تک نہیں جبکہ ہم غریبوں کی جھونپڑی کو اڑا دیا۔

اُدھر دوسرا راہب ہاتھ جوڑے' آنکھیں بند کیے خدا سے کہہ رہا ہے "تُو بڑا مہربان ہے' طوفان کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے' ہماری پوری جھونپڑی ہی اڑا دیتا' یہ تو تھا جس نے آدھی کو بچا لیا' اور ہم راہبوں کا خیال کیا ہم تیرے احسان مند ہیں اور شکر گزار"

دوسری رات راہب نے ایک گیت لکھا "ہم اب تک اس لطف سے ناواقف تھے جو لوگوں کو آدھی چھت سے حاصل ہوتا ہے گزشتہ شب ہم لوگ آدھی چھت کے نیچے سو رہے تھے۔ چاند اور دنوں کے چاند سے بہت زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہا تھا' ہمیں جس کی جھونپڑی کی چھت آدھی تھی' رات میں جب بھی ہماری آنکھیں کھلتیں تو ہمیں خوب صورت ستارے بھی نظر آتے اور پھر ہم اطمینان سے دوبارہ سو جاتے آج صبح جب بیدار ہوئے تو ہم لطف و سرخوشی سے بھرے ہوئے تھے جس سے پہلے واقف نہیں تھے اگر خدا نے خواب میں ذرا سا اشارہ کر دیا ہوتا تو میں خود اپنے ہاتھوں سے بہت پہلے ہی آدھی چھت گرا دیتا۔ اس سلسلے میں طوفان کو زحمت دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہر بات کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ ہم اپنے پاس موجود چیزوں کو کس انداز سے دیکھتے ہیں ہمارا موجودہ نظام تعلیم بہت پہلے سے غلط طرز فکر پیدا کرتا ہے جو کچھ پیدا کیا جا رہا ہے وہ

اپنی چیزوں کی قبولیت نہیں بلکہ چیزوں کے لیے دوڑ ہوتا ہے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ دوسروں کے پاس کیا ہے اس سے تو ہم واقف ہی نہیں کہ ہمارے پاس کیا ہے ایسی صورت حال میں زندگی غلط ڈگر پر چلنا شروع ہو جاتی ہے اور صرف موت ہی اس اذیت سے چھٹکارا دلاتی ہے' اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز مددگار نہیں ہوتی یہ نتیجہ ہے غلط تعلیم کا۔

صحیح تعلیم یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے پاس موجود چیزوں کو کس طرح نکھاریں' لیکن مقابلہ قطعی نہیں۔ مقابلے کا تصور جیسے ہی دماغ میں گھر بناتا ہے' مسائل سر اٹھانا شروع کر دیتے ہیں لیکن کیا کیا جائے ہمارا موجودہ ماحول مقابلے کو ہی راس آتا ہے۔

کوئی بھی کسی موچی کی سالگرہ کبھی نہیں مناتا لیکن ایک سیاستداں کی سالگرہ منائی جاتی ہے کیوں؟ سیاستداں میں آخر ایسی کون سی خصوصیت ہوتی ہے؟ اس کی وجوہات کیا ہیں؟ دنیا میں سیاستدانوں نے وہ کون سی اچھی بات کی ہے کہ ہم ان سے متاثر ہیں۔ کوئی بھی نہیں وہ تو ہم صرف اس لیے مناتے ہیں کہ وہ اعلیٰ مرتبے کا شخص ہے اور ایک اونچے عہدے پر مامور ہے اس لیے اس کی سالگرہ مناتے ہیں ہم چیزوں کا غلط انداز میں موازنہ کرتے ہیں۔

آپ نے ابراہم لنکن کا نام سنا ہوگا' اس کا باپ موچی تھا اور ابراہم امریکہ کا صدر بن گیا بہت سے لوگوں کو موچی کے بیٹے کا صدر ہو جانا' پسند نہیں آیا۔ ایسا واقعہ ہمارے ملک میں ہوتا تو یہی محسوسات ہوتیں چنانچہ وہ جب سینیٹ میں پہلی تقریر کرنے کھڑا ہوا تو ایک ممبر ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھا دوسرے بہت سے لوگوں سے بھی برداشت نہ ہوا لیکن جو قدرے مہذب تھے وہ اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھے رہے اپنی ناپسندیدگی پر پردہ ڈالے ایک شخص کھڑا ہوا اور صدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تقریر کے دوران کسی خام خیالی میں نہ رہنا تمہارا باپ جوتے سیا کرتا تھا۔''

عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ جوتے سینا ایک نیچے درجے کا کام ہے حالانکہ ہر شخص جوتے پہنتا ہے جوتے پہننا برا نہیں ہے لیکن اس کو سینا برا ہے۔ سچ ہے کہ یہ دنیا ابتری کا شکار ہے اگر جوتے کو سینا برا ہے تو اسے پہننا اور زیادہ برا ہونا چاہیے یہ کس قسم کا پاگل پن ہے۔

جواب میں لنکن نے کیا کہا؟ لگتا ہے وہ گہری سوچ والا شخص تھا اس نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرے والد جوتوں کو بہت اچھا سیتے تھے تم نے مجھے بڑے

برے وقت میرے والد کی یاد دلائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے یاد دہانی کرانے والے معزز شخص کا خاندان میرے والد کے سئے ہوئے جوتے پہنا کرتا تھا میں پوچھتا ہوں کہ آیا میرے والد کے سئے ہوئے جوتے کیا اچھے نہیں ہوا کرتے تھے؟ کیا وہ کمزور ہوتے تھے' دیکھنے میں اچھے نہیں ہوتے تھے' مضبوط نہیں ہوتے تھے؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ انتہائی دل جمعی اور توجہ سے جوتے تیار کرتے تھے اور جو بھی ان سے خریدتا تھا وہ بہت خوش ہوتا تھا میرے لیے بہت دشوار ہے کہ میں اتنا اچھا صدر ثابت ہوں جتنے اچھے میرے والد موچی تھے۔''

اگر صحیح قسم کی تعلیم رائج ہوتی تو مرتبے' کام کی نوعیت وغیرہ ختم ہو کر رہ جاتی۔ جوتا سازی کو برا نہیں سمجھنا چاہیے روٹیاں پکانا یا اینٹیں بنانا یا کوئی دوسرا کام کلنگ کا ٹیکہ نہیں ہوتا۔ کوئی شخص اعلیٰ ہے نہ ادنیٰ' ہر شخص ویسی ہی زندگی گزارنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتا ہے۔

زندگی میں ہر ایک چیز کی ضرورت پڑتی ہے' سڑک بنانے اور صاف کرنے کے لیے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اینٹیں بنائیں۔ یہ سب لوگ ویسے ہی اہم ہوتے ہیں جیسے ملک چلانے والے۔ کوئی شخص کم حیثیت کا مالک نہیں ہوتا' کوئی کمتر نہیں۔ خصوصی حیثیت کسی کی نہیں ہوتی۔ زندگی میں ہر شخص ایک دوسرے سے جڑا رہتا ہے' زندگی متفقہ مقصد کے لیے اشتراک عمل یا امداد باہمی کا نام ہے۔ اس میں کوئی شخص اعلیٰ ہے نہ ادنیٰ؟ چپراسی کسی بھی طرح صدر سے کم حیثیت نہیں۔ جب تک اعلیٰ و ادنیٰ کا تصور قائم ہے انسانی ذہن کو سکون نہیں مل سکتا کیونکہ چپراسی صدر بننے کی تگ و دو میں لگا رہے گا۔ یہ قدرتی امر ہے وہ اپنے بیٹے کو صدر بنانے کے چکر میں لگا رہے گا' یہ بھی قدرتی امر ہے وہ ایسا ہی چاہے گا۔

جب تک تعلیم عہدہ و منصب سے قطع نظر ہر شخص کو عزت و وقار کا مقام نہیں دیتی اور ہر شخص کی حیثیت کو برابر تسلیم نہیں کرتی امن و سکون کا فقدان رہے گا۔ پوری زندگی کی بہتری کے لیے ہر شخص کا کام اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ایک موچی یا درزی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ایک موسیقار۔ سوال صرف یہ ہے کہ ایک شخص اپنے کام کو کس قدر اچھا اور معیاری کرتا ہے یہ نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔

کبیر ایک پارچہ باف (جولاہا) تھا وہ کپڑے بُنا کرتا تھا لوگوں نے اس سے کہا کہ وہ کام چھوڑ دے' برگزیدہ لوگوں کے لیے یہ کام ٹھیک نہیں اس نے جواب دیا ''اگر برگزیدہ شخص کا

لباس پہننا ٹھیک ہے تو اسے بُنتا کیوں ٹھیک نہیں؟ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں کپڑے بنتے ہوئے سوچا کرتا تھا کہ گاہکوں سے زیادہ پیسے وصول کروں لیکن برگزیدگی کے بعد زیادہ قیمت وصول کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔ اب میں کپڑا بنتے ہوئے سوچتا ہوں کہ کم سے کم قیمت میں اچھے سے اچھا کپڑا کیسے فراہم کروں، میں انتہائی مسرت کے ساتھ مضبوط کپڑے تیار کرتا ہوں اور گاہکوں کو خوشی خوشی کپڑے دیتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے خدا خود گاہکوں کی صورت میں کپڑے لینے آتا ہے۔"

وہ ناچتا ہوا مارکیٹ گیا اور پوچھا کہ کس بھگوان نے اس کی محنتوں اور دعاؤں کو قبول کیا ہے، اس نے اس شخص کے پاؤں کو چھوا جس نے اس کے کپڑے خریدے تھے اور کہا کہ "او بھگوان کپڑے کو احتیاط سے پہن، میں نے اسے انتہائی توجہ محبت دعاؤں اور محنتوں سے بُنا ہے۔"

کیا کپڑے بننا غلط ہے؟ کیا جولاہا ہونا غلط ہے؟ زندگی میں کوئی چیز غلط نہیں، ہر چیز ہر کام زندگی کی ضرورت ہوتا ہے، کام سے متعلق کوئی اعلیٰ وادنیٰ کام کی تخصیص نہیں ہونی چاہئے لیکن تعلیم تو مکمل طور پر غلط ہے اسکول کے چپراسی کا کوئی مقام اور وقار نہیں ہوتا اگر ایسا ہے تو کیا کوئی بچہ چپراسی بننا پسند کرے گا؟

یہ نوجوانوں پر منحصر ہے کہ وہ منظر کو تبدیل کریں اور ایک انقلاب لے آئیں، جب تک ایسا نہیں ہوتا اعلیٰ وانیٰ کی سوچ جاری رہے گی۔ چند دن قبل مجھے دعوت دی گئی شاید منتظم حضرات کی غلطی کی وجہ سے کہ ٹیچرز ڈے پر آ کر کچھ گفتگو کروں انہوں نے کہا کہ ٹیچرز کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ ایک استاد صدر ہو گیا میں نے کہا "یہ غلط ہے استاد کے لیے عزت وافتخار اس میں ہے کہ وہ خود کو ایک اچھا ٹیچر ثابت کرے یہ نہیں کہ صدر بن جائے اگر سارے استاد صدر بننے کی دوڑ میں شامل ہو جائیں تو یہ ایک تباہی ہوگی۔" لیکن یہ دوڑ جاری ہے اگر وہ صدر نہیں بن سکتے تو پھر وہ چاہیں گے کہ وزیر تعلیم بنیں یا وائس چانسلر یا پھر کچھ اور بن جائیں۔

یہ سب ہی غلط ہے استاد کی عزت واحترام اچھا استاد بننے میں ہے اگر کوئی ٹیچر صدر بننے کی کوشش شروع کر دے تو یہ ٹیچر کے لیے عزت کی بات نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ لیجیے کہ صدر کو اپنا عہدہ چھوڑ کر ٹیچر بننا چاہیے نہ کہ استاد کو، کیوں؟ اس لیے کہ استاد اور سیاستداں میں کوئی مطابقت ہے ہی نہیں؟ ٹیچر اگر صدر بنتا ہے تو وہ اپنا مرتبہ کم کرتا ہے جبکہ اگر صدر استاد ہو جاتا

ہے تو اس میں استاد کی عزت افزائی ہے۔ ٹیچر ہونے کا مطلب سادہ ذریعہ معاش کا حامل انتہائی عزت ووقار کی زندگی۔ یہ زندگی کی بنیادی ضرورت ہے یہ ایک سرخوشی، ایک خدمت ایک تخلیقی عمل، ایک عبادت ہے کوئی ٹیچر اگر اسے چھوڑ کر کسی اور طرف جاتا ہے تو یہ قابلِ عزت واحترام نہیں بلکہ عزت ہونی بھی نہیں چاہیے لیکن ہمارے ذہن میں سیاست اور عہدہ ومنصب بہت اہم ہو چکا ہے ہم لوگ عجیب وغریب لوگ ہیں چھوٹے اسٹول پر بیٹھا ہوا شخص چھوٹا سمجھا جاتا ہے۔

میرے ایک واقف کار نے ایک واقعہ سنایا، مدارس میں ایک مجسٹریٹ تھا انگریز مجسٹریٹ، وہ تھوڑا سا انفرادی قسم کا انسان تھا حالانکہ اس کا فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہے کہ کس میں انفرادیت نہیں ہے، بہرحال وہ کورٹ روم میں بیٹھا ہوا تھا جو بھی اس سے ملاقات کے لیے آتا اسے ایک خاص قسم کی کرسی پر بیٹھاتا تھا۔

اس کے پاس الگ الگ کمروں میں مختلف قسم کی کرسیاں، عہدہ اور دولت مندوں کے مرتبے کے مطابق رکھی ہوئی تھیں۔ وہ جس کرسی کو مناسب خیال کرتا اسے منگواتا تھا۔ چھوٹا اسٹول عام سے شخص کے لیے تھا، جسے چاہتا وہ اس پر بٹھاتا تھا اگر کوئی غریب ہوتا تو اسے نہیں بٹھایا جاتا تھا وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص سے جو چاہتا کہا کرتا تھا۔ چھوٹے اسٹول کے بعد ایک قدرے بہتر اسٹول تھا۔ اس کے بعد ایک کرسی تھی، اسٹول سے ذرا مضبوط۔ اسی طرح درجہ بندی کی گئی تھی اور سات قسم کے درجے تھے۔

ایک دن ایک شخص آیا جو اپنی شکل وصورت سے غریب لگ رہا تھا پہلے تو مجسٹریٹ نے اس سے کھڑے کھڑے گفتگو کرنی چاہی لیکن داخل ہوتے ہوئے اس نے کہا "میں قصبے میں زمین کرائے پر دیتا ہوں" مجسٹریٹ نے اپنے چپراسی سے کہا کہ وہ دو نمبر کرسی لے آئے۔ چپراسی دو نمبر کرسی لانے کے لیے گیا ہی تھا کہ اس شخص نے بتایا کہ اسے "حکومت نے رائے بہادر کا خطاب دیا ہے" یہ سنتے ہی مجسٹریٹ نے چپراسی کو حکم دیا کہ کرسی نمبر چار لائی جائے جب چپراسی چار نمبر کرسی لینے کے لیے بھاگا تو آنے والے نے کہا "میں نے ابھی جلد ہی وار فنڈ میں چار ملین روپے دیئے ہیں" مجسٹریٹ نے اپنے پہلے والے حکم میں تبدیلی کرتے ہوئے چیخ کر کہا کہ کرسی نمبر چھ لے آؤ اتنے میں ملاقاتی نے کہا کہ "تم چپراسی کو کیوں تنگ کر رہے ہو اس سے

کہو کہ کرسی نمبر سات لے آئے کیونکہ میں اپنے تعارف کے طور پر کچھ اور بتانے والا ہوں اس لیے بہتر ہوگا کہ سات نمبر کرسی منگوالو۔"

ہم اس انفرادی شخصیت کے مالک مجسٹریٹ پر ہنس سکتے ہیں لیکن ہم سب لوگ ہی اسی طرح کے انفرادی مزاج رکھنے والے شخص ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں صدر کے لیے، وزیراعظم کے لیے یا گورنر کے لیے عزت واحترام ہوتا ہے۔ کیا ہم آدمی کی آدمیت سے ذرا سی بھی عزت کرتے ہیں بالکل تہی دامن، بے نام شخص جس کے پاس نہ کوئی عہدہ ہو نہ میرٹ سرٹیفکیٹ اور اس کی جیب بھی خالی ہو؟ اگر ہم ایک عام شخص کی عزت نہیں کرتے تو یاد رکھئے ہم کسی کی بھی عزت نہیں کرتے، قطعی نہیں، ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ محض کرسی کی عزت ہوتی ہے، بڑی اور چھوٹی کرسی کی۔

یہ سب کچھ وہی ہے جو تعلیم ہمیں سکھاتی ہے، یہ سب فضولیات ہیں ایسی کہ آتش برد کر دی جائے پورا نظام تعلیم ہی غلط ہے۔ ضروری ہے کہ ایک نئی بنیاد رکھی جائے وہ نئی بنیاد ایسی ہوگی جس میں محبت پڑھائی جائے نہ کہ مقابلہ۔ ہمیں چاہیے کہ ہم انسانوں کو چاہے وہ جیسا بھی ہو عزت واحترام دینے کی تعلیم دیں۔ عہدہ ومنصب اور دولت کو نہیں، یہ ضروری ہے کہ عزت و احترام انسان کے کام کی نوعیت پر نہ ہو، ایسا رویہ اپنایا جائے تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ پوری زندگی لوگوں کے اشتراک عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی کے بعد ہم جان سکیں گے کہ فردِ واحد کی ذہنی استعداد کیا ہے اس کے لیے کسی سے موازنہ اور مقابلہ بھی نہیں کریں گے۔

جیسا کہ میں نے آج صبح آپ سے کہا تھا کہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کسی سے کسی کا موازنہ کیا جائے کیونکہ ہر ایک فرد اپنی ذات میں الگ ہوتا ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ تم کسی دوسرے شخص کے مقابلے میں کمزور ہو یا زیادہ ذہین یا کم ہینڈسم ہو۔ اس قسم کے مقابلے خطرناک اور پرتشدد ہوتے ہیں۔

تمام مسائل اسی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ہر ایک شخص کو جیسا بھی ہے قبول کرنا چاہیے اور اس کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھنے دینا چاہیے۔

ایک گلاب کا پھول گلاب کا پھول ہے اور گلِ یاسمین، گل یاسمین وہاں ایک چھوٹی گھاس کا پھول بھی ہے۔ جس کا اپنا وقار اور حسن ہے۔ پراسرار اور اہم بات یہ ہے کہ وہ کھل کر حسن بکھیر

رہا ہے، اپنے آدھے سفر پر پہنچ کر رک نہیں گیا۔ گلاب کے پھول سے اس کا موازنہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گلاب کے پھول کا اپنا الگ وقار اور حسن ہے جبکہ گھاس کے پھول کا اپنا۔ ایک چھوٹی چڑیا اپنا نغمہ بکھیرتی ہے اور ایک بڑا پرندہ اپنا راگ الاپتا ہے۔ اس موازنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ کس نے اچھا گایا، ہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ گانا اپنے دل کی گہرائیوں سے گایا گیا ہے یا نہیں۔ ایک کا موازنہ دوسرے سے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہر شخص خدا کی انتہائی حسین تخلیق ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم اسے جیسا ہے ویسا ہی تسلیم کریں ہمیں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ہمارا پورا نظامِ تعلیم، معاشرہ اور تہذیب، اس کی تمام چھپی ہوئی باتوں کو جو پروان چڑھنے کی منتظر ہیں، دکھائی دینا چاہیے ان کو اسی طرح پڑا نہیں رہنا چاہیے۔ یہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اس میں نہ عجلت ہو نہ شکوک وشبہات، یا موازنہ سوائے محبت اور سرخوشی کے۔

جب ایک شخص کی تمام صلاحیتیں پھولتی پھلتی ہیں تو وہ باعث فرحت وانبساط ہوتی ہیں اور جب اس سے پھول جیسی خوشبو پھوٹتی ہے تو سکون ملتا ہے ایک ایسا شخص ہی سچائی کا اور خدا کا متلاشی ہوسکتا ہے صرف ایسا شخص جو پرسکون ہو وہی زندگی کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے جو شخص مقابلے میں شامل رہ کر پریشان رہتا ہے اسے سکون نہیں مل پاتا جو پرسکون ہے، جو خود کو تسلیم کرتا ہے وہی خوش رہتا ہے اور اپنے پھولوں کی خوشبو سے مہکتا رہتا ہے اسے ہی خود بخود تقویٰ نصیب ہوتا ہے اور ہر جانب سے تقویٰ کے تجربات ہوتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو خستہ اور بے آرام ہو وہ خدا تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ جب روحانی سکون کے تمام دروازے اس کے اندر کھلے ہوں صرف اسی وقت خدا ملا کرتا ہے۔

چنانچہ تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر شخص کو روح کی بالیدگی کے تجربات سے ہم کنار کرے لیکن فی الوقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہر شخص خوشیوں کے تجربات اور سکون سے یکسر خالی ہے۔ خدا دور کی مسافت اور فاصلے پر ہے اس لیے اور اپنے نہ ختم ہونے والے مسائل کی بناء پر، انسان عبادت گاہوں میں جاتا ہے وہاں رکھے ہوئے بکس میں عطیات ڈالتا ہے مذہبی پیشواؤں کے سامنے جھکتا ہے یہ سب بے کار محض ہے۔ اپنے کھنچاؤ کی تکلیف کے لیے وہ خدا کی مدد چاہتا ہے وہ جب الیکشن میں ناکام ہوتا ہے تو خدا کی مدد چاہتا ہے تعویذ بنواتا ہے یا نام

نہاد پیشواؤں سے پھنکواتا ہے تا کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔

گزشتہ روز کسی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں کوئی ایسا عمل بتا سکتا ہوں جس سے وہ ریس کورس میں کامیابی پا سکے۔ ہمارے ملک کے سارے سادھو اور سنیاسی یہ کرتے ہیں۔ میں نے کہا "میں ایک عام سا آدمی ہوں' نہ سادھو ہوں نہ راہب' پھر کیسے کوئی اشارہ یا طریقہ بتا سکتا ہوں میں اس قسم کا اشارہ کیسے دے سکتا ہوں؟" لیکن بہت سے سادھو' سنیاسی اور مہاتما ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں یا پھر اگر تم خدا سے رجوع کرو تو وہ تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ میں کوئی مدد نہیں کر سکتا لیکن سب باتیں ہوتی جا رہی ہیں گھوڑوں کی دوڑ یا انتخابات میں کامیابی کے لیے اشارے دیئے جا رہے ہیں۔ اس قسم کے سادھو اور مہاتما دہلی میں ہر جانب پھرتے رہتے ہیں کیونکہ تمام ہارے ہوئے اور جیتے ہوئے لوگ' دونوں ہی ان کے چرنوں کو چھونے کے لیے موجود ہوتے ہیں

ٹینشن' خوف' شکست خوردگی اور تکلیف میں مبتلا لوگ مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں تا کہ تسلی اور تسکین حاصل کر سکیں۔ اس قسم کا مذہب غلط ہے' ایسے لوگ جو ایسا کرتے ہیں وہ غیر مذہبی حرکت کرتے ہیں صرف ایک ایسا شخص جو اپنے ذہن کو ہر طرح سے پرسکون رکھتا ہے جس کے ذہن میں کسی قسم کی ہلچل' کوئی تضاد نہ ہو جس میں محبت اور عزت و احترام بھرا ہو جو سب سے نفرت کی بجائے دردمندی رکھتا ہو وہی مذہب کے قریب پہنچ سکتا ہے۔ خدا خود کسی دن اس کے دروازے پر دستک دے کر اس کے اوپر اپنا دستِ رحمت رکھ دیتا ہے۔ مذہب کا مطلب یہ نہیں کہ گیتا یا کسی صحیفے کو بار بار پڑھا جائے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ دنیا میں غیر مذہبیت بھری پڑی ہے۔

مذہبی تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو مقابلے سے پاک ہو جس میں عدم تشدد ہو' نفرت نہ ہو' محبت اور رحم دلی ہو۔ ایسی ہی مذہبی تعلیم سے ایک شخص ہندو یا جینا ہو سکتا ہے' رائج مذہبی تعلیم دیوانگی ہے' ایک طرح کا مرض ہے۔

میں نے آپ کے سامنے چند گزارشات رکھی ہیں اگر اس پس منظر میں آپ اپنی انفرادیت کو پرکھنے کی کوشش کریں اور تھوڑا غور کریں کہ کیا آپ واقعی مقابلہ اور حسد میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں یا سکون کے راستے پر چلنا چاہتے ہیں' محبت اور خوشیوں کے راستے پر اور اپنے

اندر موجود اس صلاحیت کو بیدار کریں جس سے خوشیوں کی مہک پھوٹ سکے۔ صرف اسی وقت آپ صحیح معنوں میں ایک طالب علم ہو سکتے ہیں فی الوقت جبکہ نہ تو یونیورسٹی صحیح ہے نہ تعلیمی نظام درست ہے تو ہم مسئلے کے حل کو کہاں دیکھتے ہیں؟ اساتذہ اچھے نہیں ہیں' تعلیمی نظام ٹھیک نہیں ہے تو اسے کون ٹھیک کرے گا؟

یہ کام نوجوان کر سکتے ہیں کیونکہ انہی میں بغاوت کی رمق موجود ہوتی ہے حالانکہ ہندوستان میں وہ رمق قریب قریب مردہ ہو چکی ہے۔ ہزاروں برسوں سے یہاں نوجوان پیدا ہی نہیں ہوا یہاں بغاوت کا جذبہ نہیں صرف راکھ کا ڈھیر ہے لیکن پھر بھی اگر کہیں امید ہے تو انہی جوان لوگوں سے ہے اگر جوان لوگ پورے تعلیمی سسٹم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اس تمام ڈھانچے کو گرانے کے لیے تیار ہوں تو آج نہ سہی کل دنیا سے جنگی جنون ختم ہو جائے گا۔ ایسی دنیا جو قوم پرستی پر یقین رکھتی ہے ختم ہو سکتی ہے۔ یہ سرحدیں ختم ہو سکتی ہیں' یہ حماقتیں ختم ہو سکتی ہیں اور انسانوں کا ایک مہذب معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کا انحصار نوجوانوں پر ہے' انہیں طرز کہن کے سامنے کھڑا ہونا ہے عظیم انقلاب کا بوجھ نوجوانوں کے کاندھوں پر ہے۔ شاید انسانی تاریخ نے اس سے پہلے ایسی تحریک اور ایسی عظیم ذمہ داری نوجوانوں کے اوپر نہ دیکھی ہو۔

دیکھئے کیا ہم اس ذمہ داری کو قبول کر سکتے ہیں اگر ہم اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں تو انسان کو بچا سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو معاملات پہلے ہی خراب تر ہو چکے ہیں بس کھیل ختم سمجھئے پھر یہ صرف اطلاع بہم پہنچانے والی بات ہوئی یہ اطلاع کہ انسان ختم ہو چکا۔ انسان کی موت کا پہلے ہی انتظام ہو چکا ہے ہم کسی بھی وقت ختم ہو سکتے ہیں۔ پچاس ہزار سے زیادہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم دنیا کو تباہ کرنے کے لیے تیار پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ضرورت سے بہت زیادہ ہیں اس سے تو ایسی ایسی سات دنیائیں تباہ کی جا سکتی ہیں۔

کیا ہوگا؟ ہم ایک انسان کو سات بار مار سکتے ہیں ہم نے ضرورت سے کہیں زیادہ انتظامات کر رکھے ہیں اگر صرف ایک سیاستدان کا دماغ خراب ہو گیا جبکہ وہ تو پہلے ہی آدھے پاگل ہیں تو کسی بھی لمحے وہ پوری انسانیت کو لے ڈوبیں گے۔

کون بچائے گا؟ ذمہ داری کس کی ہے؟

آپ کو توقع نہیں ہوگی کہ میں آپ سے اان امور پر گفتگو کروں گا' آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں امتحان پاس کرنے' کامیاب ہونے' آگے بڑھنے اور بلند حیثیت اختیار کرنے کے گر سکھاؤں اور بتاؤں گا۔ نہیں' میں یہ نہیں کروں گا ان تمام چیزوں کے بارے میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں کیوں کہ ہم ان چیزوں میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔

میری درخواست ہے کہ آپ کامیاب نہ ہوں لیکن صحیح معنوں میں انسان بن جائیں کامیابی کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ کسی حکومتی عہدے پر نہ پہنچیں لیکن اپنے اندر ضرور جھانکیں جہاں کوئی بیش بہا چیز موجود ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ کسی سے مقابلہ نہ کریں لیکن اپنی شخصیت کی محبت بھری صلاحیت کو بیدار کریں۔ میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ بھی نئے معاشرے کی تعمیر میں اس کی ایک اینٹ بن جائیں' میری آپ سے بس یہی خواہش ہے۔

میں آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے خاموشی اور محبت سے سنا' میں اس نئے انسان کو جو ہم سب کے اندر بیٹھا ہوا ہے سلامِ عقیدت پیش کرتا ہوں' برائے کرم میرے سلامِ عقیدت کو اس دیوتا کے لیے قبول کیجیے۔

تعلیم اور مذہب

ایک فقیر بالکل تنہا تھا اس نے خواب میں خدا کو دیکھا جو خود بھی اکیلا اور اس سے زیادہ تنہا تھا فقیر نے الجھن کا شکار ہوتے ہوئے خدا سے سوال کیا ''آپ اتنے تنہا کیوں ہیں؟ آپ کے تو بہت سارے پر جوش حامی ہیں' وہ سب کہاں ہیں؟

یہ سننے کے بعد خدا نے فرمایا ''میں ہمیشہ سے تنہا ہوں چنانچہ صرف وہ لوگ جو بالکل تنہا ہیں' وہی میرا مشاہدہ کر سکتے ہیں اور جہاں تک سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے تو وہ نام نہاد پر جوش حامی اور مذہبی لوگ میرے قریب کبھی نہیں رہے کچھ لوگ راما کے ساتھ ہیں' کچھ لوگ کرشنا کے ساتھ اور کچھ لوگ مہاویرا کے ساتھ۔ میرے ساتھ کوئی بھی نہیں ہے' میں ہمیشہ سے اکیلا اور تنہا ہوں چنانچہ ایک ایسا شخص جو کسی کے ساتھ نہیں تنہا اور اکیلا ہے وہ میرے ساتھ ہے۔''

فقیر آدھی رات کو خواب سے بیدار ہوا اور کانپتا ہوا میرے پاس آیا' اس نے مجھے اٹھا کر پوچھا ''ایسے خواب کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟''

میں نے کہا ''اگر یہ خواب تھا تو ہم کوئی معنی و مطلب نکالیں لیکن یہ تو ایک حقیقت ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ اس حقیقت اور سچائی کا مطلب سمجھا جائے؟ اپنی آنکھیں کھولو اور دیکھو وہ لوگ جو ہندو ہیں بدھ مت سے تعلق رکھتے ہیں یا عیسائی ہیں یعنی وہ جو وارثتاً مذہبی ہیں وہ مذہبی نہیں ہیں۔ مذہب صرف ایک ہو سکتا ہے' حقیقی مذہبی ذہن انسان کی بنائی ہوئی سرحدوں میں نہیں ہوتا سچائی کے مشاہدے میں کوئی گروپ' کوئی مسلک' کوئی صحیفہ نہیں آیا کرتا؟ آزادی اور غیر محدود شے کے لیے سرحدیں نہیں ہو سکتیں، بے زبانی کے لیے اصول نہیں ہو سکتے؟ خالی عبادت گاہیں تمہیں کہاں مل سکتی ہیں؟ا

اس سے قبل کہ میں تعلیم یا مذہب کے متعلق کچھ کہوں یہ ضروری ہے کہ اس کی وضاحت کر دوں کہ مذہب سے میری مراد مذہب نہیں ہے۔ مذہبی ہونے کا مطلب ہندو اور عیسائی ہونے سے قطعی مختلف ہے کسی بھی مذہب اور مسلک اختیار کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مذہبی

ہے بلکہ یہ تو مذہبی ہونے کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے' ایک شخص جب تک ہندو یا عیسائی ہے اس وقت تک اس کا مذہبی ہونا ناممکن ہے۔

ایسے تمام لوگ جو تعلیم اور مذہب کے متعلق سوچتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تعلیم کی ساتھ مذہب بھی ہونا چاہیے ان کے لیے مذہب کا مطلب ہندو' سکھ یا عیسائی ہوتا ہے اس قسم کی مذہبی تعلیم نہ صرف مذہبیت نہیں پیدا کرتی بلکہ انسان کو اور زیادہ غیر مذہبی کر دیتی ہے اس قسم کی تعلیم گزشتہ پانچ ہزار برسوں سے جاری ہے لیکن اس نے نہ تو ایک اچھا انسان پیدا کیا اور نہ اچھی سوسائٹی وجود میں آ سکی (اس کے برخلاف مذہب کے نام پر خون خرابہ' تشدد اور غیر مذہبیت میں اضافہ ہو گیا۔ اتنا اضافہ کہ دوسری کسی وجہ سے نہیں ہوا ہو گا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ خدا کے منکرین جو کسی بھی مذہب کو تسلیم نہیں کرتے وہ اس قسم کے گھناؤنے جرائم سے بچے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے جرائم ہمیشہ مذہبی لوگوں کے ہاتھوں ہوئے ہیں ملحدانہ یا کافرانہ فکر رکھنے والوں نے نہ تو کبھی کسی عبادت گاہ کو نذرِ آتش کیا اور نہ لوگوں کو قتل کیا۔ یہ مذہبی لوگ ہیں جنہوں نے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ یہ مذہبی لوگ ہیں جنہوں نے آدمی کو آدمی سے الگ کر دیا وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ وہ مذہبی ہیں انہوں نے لوگوں کے درمیان دیوار کھڑی کی۔ الفاظ' عقیدہ پرستی اور صحیفوں نے ایک شخص کو دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ مذہب و مسلک نے بڑی بڑی خندقیں کھود کر انسان کو اپنے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں قید کر دیا)

مذہب کے نام پر اس قسم کی تعلیم کا جاری رکھنا انتہائی خطرناک ہے۔ اس طرح کی تعلیم نہ تو مذہبی ہے اور نہ کبھی رہی ہے اور نہ کبھی مستقبل میں ہو سکتی ہے کیونکہ جن لوگوں کو یہ تعلیم دی گئی تھی وہ ایک اچھا انسان بنانے میں ناکام رہے ہیں اس تعلیم سے پیدا ہونے والے تنازعات نے انسان کے ذہن کو تشدد' غصہ اور نفرت سے بھر دیا ہے۔

چنانچہ پہلی بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تعلیم میں مذہب سے میری مراد کوئی مسلک وغیرہ نہیں اور نہ اس کا اعتقاد اور عقیدہ پرستی ہے / اگر ہم تعلیم کا تعلق مذہب سے کرنا ہی چاہتے ہیں تو ہندو' عیسائی بدھ مت کے الفاظ کو نکال دینا ہو گا۔ تعلیم کے ساتھ کسی مذہب و مسلک کا رشتہ نہیں رہنا چاہیے بلکہ یہ زیادہ بہتر ہو گا کہ غیر مذہبی ہوں کیونکہ ایک غیر مذہبی شخص کا مذہبی ہونے کا امکان بہ ہر صورت موجود رہتا ہے جبکہ ایک نام نہاد مذہبی شخص کا

ذہن ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کا ذہن بند ہو وہ کبھی مذہبی نہیں ہو سکتا۔ سچائی کی تلاش کے لیے ذہن کا خالی اور آزاد ہونا ضروری ہوتا ہے)

اگر مذہبی معاشرہ تعمیر کرنا ہے تو ہندو عیسائی وغیرہ نہیں ہونا چاہیے اس میں نہ تو یہ ہو کہ اس کا تعلق مشرق سے اور اس کا مغرب سے ہے۔ ایسا معاشرہ تمام انسانوں کا معاشرہ ہو گا سب لوگوں کا سب لوگوں کے لیے اس کا تعلق کسی خاص علاقے سے نہیں ہو سکتا کیوں کہ ہم جب تک انسانوں کو تقسیم کرتے رہیں گے اس وقت تک ہم دشمنیوں اور جنگوں سے آزاد نہیں ہو سکتے جب تک انسانوں کے درمیان دیواریں قائم رہیں گی اس وقت تک ہم ایک ایسا معاشرہ قائم نہیں کر سکتے جس میں محبت اور خوشیوں کے ساتھ رہا جائے؟ اب تک جو بھی سوسائٹی معرضِ وجود میں آئی ہے اس کی بنیادیں محبت اور پیار پر نہیں رکھی گئی ہیں)

گزشتہ تین ہزار برسوں میں پندرہ ہزار جنگیں لڑی گئیں' پندرہ ہزار جنگیں ان تین ہزار برسوں میں؟ سوچئے کتنا ناگوار تصور ہے' اتنی بہت ساری جنگیں جس کی کوئی خاص وجہ نہیں۔ ہر سال پانچ لڑائیاں' اس سے کیا مطلب نکلتا ہے؟ تین سو برس کا مختصر سا وقفہ ہے جس میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ تین سو سال کا عرصہ وہ بھی ایک ساتھ یا لگاتار نہیں' ان برسوں کو ایک ایک کبھی دو دو دن کر کے جمع کیا گیا ہے یا پھر دس دن۔ بس کل یہی تین سو سال کے دن جو امن میں گزرے۔ تین سو سال امن' تین سو سال جنگ؟ ظاہر ہے یہ امن کے دن بھی حقیقی امن کے دن نہیں تھے جو ہونا چاہیے تھے۔ یہ امن بھی جھوٹا امن تھا' سچ یہ ہے کہ ہم جسے امن کا دن کہتے ہیں وہ دن ایسے تھے جس میں جنگ کی تیاری کی جاتی تھی۔

میں انسان کی تاریخ کو دو حصوں میں بانٹ رہا ہوں ایک تو جنگ کا دور اور دوسرا......وہ دور جس میں جنگ کی تیاری کی گئی۔ حقیقتاً ہم کوئی ایسا دور نہیں پاتے جسے امن کا دور کہا جائے اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں انسانیت کے بہت سے حصے ذمہ دار ہیں اور وہ کون ہے جس نے انسانیت کو تقسیم کیا؟ کیا یہ مذاہب' مطمحِ نظر' دینی اور سیاسی عقائد نہیں جس نے بانٹ رکھا ہے؟ کیا یہ قومیں' قومیتیں' نظریات نہیں جس نے تقسیم کر رکھا ہے؟ یہ بطورِ خاص مذاہب ہیں جس نے انسانیت کو تقسیم کر رکھا ہے۔

ان تمام لڑائی جھگڑوں کی پشت پر عقیدے اور نظریات ہیں۔ چاہے وہ نظریات مذہبی

ہوں یا سیاسی، وہی تنازعات کا باعث ہوتے ہیں اور تنازعات بالآخر جنگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ آج کل بھی اشترا کی روس اور جمہوری امریکہ دو مذاہب میں بٹا ہوا ہے اور لگتا ہے کہ دونوں مذاہب میں جنگ ہو جائے گی۔ میں پوچھتا ہوں کیا انسانی تقسیم کو روکنا ممکن نہیں ہے جسے خیالات اور نظریات کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ نظریہ جیسی بے وقعت چیز کے لیے انسانوں کو قتل کر دیا جائے؟ کیا یہ ٹھیک ہوگا کہ تمہارے نظریات اور میرے نظریات ہمارے دلوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیں؟

لیکن ابھی تک یہی کچھ ہوتا رہا ہے اور اب بھی قوموں اور مذاہب کے نام پر یونینیں بن رہی ہیں یہ محبت کی یونینیں نہیں ہیں بلکہ نفرتوں کی یونینیں ہیں چنانچہ آپ خود سوچیں کہ اگر نفرتوں کا زہر اتنے موثر انداز میں پھیلایا جائے گا تو کیا کسی کو متحد کیا جا سکتا ہے۔ اڈوف ہٹلر نے ایک بار کہا تھا کہ اگر کسی قوم کو متحد کرنا ہو تو یہ ضروری ہے کہ کسی دوسری قوم سے اس کی نفرت پیدا کر دی جائے اس نے اس بات کو صرف کہا نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کیا جس کے نتائج بھرپور نکلے۔

سارے شرارتی لوگ جو اس دنیا کو زہر آلود کرتے ہیں۔ انہوں نے اس طریقہ کار کو کامیاب پایا ہے۔ مسلمان خطرناک ہیں کا نعرہ لگا تو اس نے مسلمانوں کو متحد کر دیا اور جب یہ کہا گیا کہ ہندو خطرناک ہوتے ہیں تو اس نے ہندوؤں کو متحد کر دیا۔ خطرے سے خوف جنم لیتا ہے اور ہم جس سے خوف زدہ ہوتے ہین اس سے نفرت کرتے ہیں چنانچہ تمام یونینز مذاہب محبت کی باتیں کرتے ہیں کیونکہ انہیں اتحاد کی ضرورت ہوتی ہے پھر بالآخر انہیں نفرت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس طرح محبت ایک فضول سی چیز جبکہ نفرت بنیاد بن جاتی ہے۔

لیکن میں جس مذہب کی بات کر رہا ہوں وہ نہ تو یونین ہے اور نہ تنظیم بلکہ وہ روحانی کوشش ہے یہ ایک فرد واحد کے سابقہ واقعات یا حقائق کا براہ راست مشاہدہ ہے اس کی دلچسپی اژدہام کو جمع کرنے میں نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبیت اور حقائق کا براہ راست مشاہدہ بنیادی طور پر انفرادی عمل ہوتا ہے۔

اور ہماری ساری تنظیموں کی بنیاد نفرت پر ہوتی ہے۔ نفرت اور مذہب کا آپس میں کیا رشتہ ہوتا ہے؟ وہ باتیں جو آپ کے اور میرے درمیان نفرت پیدا کرتی ہوں وہ مذہب نہیں ہو سکتا صرف وہ چیزیں جو آپ کے اور میرے درمیان محبت کے جذبات پیدا کریں، وہ مذہب

ہو سکتا ہے۔ یاد رکھیے جو چیزیں آدمی کو آدمی سے الگ اور علیحدہ کریں وہ انسان کو خدا سے کس طرح جوڑ سکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے لیکن ہم لوگ جس کو مذہب کہتے ہیں وہ ہمیں تقسیم کر دیتا ہے حالانکہ وہ نام نہاد مذاہب محبت کی باتیں کرتے ہیں اتحاد کی اور بھائی چارے کی لیکن وہ سب صرف باتیں ہوتی ہیں اور وہ جو کچھ عملاً کرتے ہیں وہ دشمنی اور نفرت پر مبنی عمل ہوتا ہے۔ عیسائیت محبت کی باتیں کرتی ہے لیکن عیسائیوں نے جتنے لوگوں کو قتل کیا کسی دوسرے نے نہیں کیا۔

شاید اچھی باتیں بری باتوں کو چھپانے یا ان پر پردہ ڈالنے کا ذریعہ ہوتی ہیں اگر آپ کسی شخص کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو محبت کے نام پر آرام سے کر سکتے ہیں اگر کوئی تشدد کرنا چاہتا ہے تو وہ عدم تشدد کو محفوظ رکھتے ہوئے تشدد کر سکتا ہے اگر میں آپ کو قتل کرنا چاہتا ہوں تو میں یہ کام آپ کی اچھائی کے نام پر کر سکتا ہوں کیونکہ ایسی صورت میں آپ تو مر جائیں گے لیکن میں قصور وار بھی نہیں ہوں گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ مریں گے، آپ قتل ہوں گے اور آپ شکایت بھی نہیں کریں گے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک ذہین حیوان ہوتا ہے چنانچہ قدرتی طور پر وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے اپنی ذہانت سے کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالتا ہے۔ شیطان نے شاید اسے مشورہ دیا ہے کہ کوئی خراب عمل کرنے سے پہلے ایک اچھا سا نعرہ بنا لیا کرو جتنا بڑا شیطانی کام ہو اتنا ہی اچھا نعرہ ہونا چاہیے۔

مذہب کے نام پر بنائی گئی تنظیموں کا نہ تو کوئی تعلق خدا سے ہوتا ہے نہ پیار محبت سے، نہ عبادت سے نہ مذہب سے۔ وہ صرف نفرت اور حسد کے جذبات کے تحت منظم ہوئی ہیں ورنہ یہ کیسے ممکن ہوتا کہ مسجدوں کو شہید کیا جائے، عبادت گاہیں نذر آتش کی جائیں، بتوں کو توڑا اور لوگوں کو قتل کیا جائے؟ لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور بہت دنوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے اگر مذہب یہی ہے تو میرا سوال ہے کہ غیر مذہبیت کیا ہوتی ہے؟ تشدد اور عصبیت کا نام مذہب نہیں ہوتا یہ صرف غیر مذہبیت کی چھپی ہوئی قسم ہے۔

چنانچہ مذہبی تعلیم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مذہب و مسلک سے پوری طرح آزاد ہو۔

لیکن نام نہاد مذہبیت کچھ نہیں دیتی سوائے بچوں کو مذہب کے نام پر فرقہ واریت کا زہر پلانے کے وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیا انہیں واقعی مذہب سے دلچسپی ہے' نہیں وہ اپنے نام نہاد مذہب سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ دلچسپی بجائے خود غیر مذہبیت ہے جب تمہارا یا میرا مذہب ہوتا ہے تو وہ مذہب کو روک دیتا ہے۔ جب مذہب میں ہمارا اور تمہارا نہیں ہوتا تو وہی خدا کی طرف مراجعت کی ابتدا ہوتی ہے۔

نام نہاد مذہبی لوگ جس مذہبی تعلیم میں دلچسپی دکھاتے ہیں وہ ان کی خود غرضی ہوتی ہے جس کی جڑیں قدیم زمانے سے ان کے اندر موجود ہیں اور اسی کے ذریعے کئی طرح کے استحصالی حربے استعمال کیے جاتے ہیں اگر موجودہ نئی نسل اس قید سے رہائی حاصل کر لیتی ہے تو سوسائٹی کی زندگی میں بنیادی انقلاب ممکن ہوسکتا ہے۔اس قسم کے انقلاب کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوں گے کیونکہ اس سے استحصالی قوتوں کے مخصوص مفادات پر کاری زک پڑے گی اور وہ لوگ جو انسان سے انسان کو لڑاتے رہتے ہیں ان کی کمر ٹوٹ جائے گی اور وہ لوگ جو مذہب کا اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں وہ بھی بے روزگار ہو جائیں گے اس طرح طبقاتی استحصال اور طبقاتی مفادات سے محفوظ رہا جاسکے گا۔لوگوں کو تقسیم کرنے کے استحصال سے کیونکہ ابھی تک صرف نام نہاد مذاہب نے مختلف طرح کا انتظام کر رکھا ہے۔

مذہبی تعلیم کے نام پر پرانی نسل چاہتی ہے کہ اپنی کم علمی' اندھا عقیدہ' عصبیت' غیر صحت مندی اور عداوتوں کو نئی نسل تک منتقل کر دے۔اس طرح اُن کی انا اور خودی کو تسکین پہنچتی ہے۔ یہی انا ہے جو انسان کو غیر صحت مند خیالات سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ترقی کی راہ میں اس سے بڑی کوئی دوسری رکاوٹ نہیں ہوتی۔ترقی تو صرف اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب عملی سرکشی موجود ہو۔

پرانی نسل کی خودی و انا اس سرکشی کو قبول نہیں کرسکتی کیونکہ اس سے ان کی آرزو' تعبید اری اور نظم وضبط کو تقویت ملتی ہے۔وہ نئی نسل کو اسی چیز کی تعلیم دیتے ہیں وہ نئی نسل کی صلاحیتوں کا خون کر دینا چاہتے ہیں جو پرانی کو رد کرتے ہوئے نئی کو تلاش کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ نسل کشی کچھ بہت ہی بالواسطہ انداز میں کی جاتی ہے۔شاید ان لوگوں کو خود بھی نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے' یہ ایک غیر شعوری طریقہ عمل ہے۔ان کے آباء واجداد اور اساتذہ نے بھی اسی طرح کا عمل ان

کے ساتھ کیا تھا۔ بلا سوچے سمجھے وہی کچھ وہ اپنے بچوں اور شاگردوں سے کیے جا رہے ہیں۔

یہ ناقص دائرہ انتہائی پرانا ہے لیکن اسے ختم کرنا پڑے گا کیونکہ وہ زندگی کو سچے مذہب سے جڑنے نہیں دے رہا ہے یہ ناقص دائرہ کہاں ہے؟ مرکزی تصور وہاں ہے جہاں سے بچے سوچنے سمجھنے کی ابتداء کرتے ہیں اعتقاد کا بیج وہیں بو دیا جائے کیونکہ ذہن اس وقت تک ٹھیک طرح سوچنے سمجھنے کا اہل نہیں ہوتا۔

اعتقاد اور سوچ' دونوں کی راہیں الگ الگ ہوتی ہیں۔اعتقاد اندھا ہوتا ہے سوچ کی اپنی آنکھیں ہوتی ہیں۔اعتقاد کی تاریکی میں بچے اپنی سوچ کی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے گنوا دیتے ہیں اسی انتہائی خطرناک مقصد کے لیے نام نہاد مذہبی لوگ' مذہبی تعلیم دینے میں شدید دلچسپی رکھتے ہیں۔یہ شدت اچھی چیز نہیں جو سچ پوچھیں تو سوچنے کی صلاحیت ختم کرنے سے بڑا کوئی گناہ نہیں لیکن والدین اپنے بچوں کے ساتھ لگاتار وہی گناہ کیے جا رہے ہیں اور یہی بنیادی وجہ ہے کہ سچے مذہب کو پذیرائی نہیں مل پائی۔

سوچ اور فکر کی تعلیم دی جانی چاہیے' اعتقاد کی نہیں۔صحیح استدلال کی تعلیم دی جانی چاہیے' بھروسے اور اعتماد کی نہیں۔

صرف اسی صورت میں مذہب اندھا اعتقاد ہونے کی بجائے ایک اعلیٰ سائنس بن سکے گا (Supreme Science) اور اس سائنس کے ساتھ فائدہ مند تعلق قائم ہوسکے گا۔ اندھے اعتقاد سے نہیں بلکہ سائنٹیفک حقائق کو فکر کی ترجیحی کسوٹی پر پرکھ کر تاکہ آدمی کو فائدہ پہنچ سکے۔

کیا آپ اس بات سے واقف نہیں کہ اعتقاد و یقین کے اندھیرے میں رہنے والے لوگ' آہستہ آہستہ سوچ اور فکر کی روشنی میں آنے کے اہل نہیں رہ جاتے؟ ان کی آنکھیں اندھیرا دیکھنے کے علاوہ کچھ اور نہیں دیکھ پاتیں۔اور وہ اپنے بچوں کو بھی اسی اندھیرے کی ٹریننگ دے رہے ہیں تاکہ وہ اپنے نابینا ہونے کو تسلیم ہی نہ کریں۔اس طرح سے کام آسان ہو جاتا ہے وہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہیں۔جب کچھ بچے اپنی آنکھوں کو بچانے کی اہلیت رکھتے ہیں' اس کے باوجود کہ یہ سب کی ملی جلی سازش ہے' تو سب جانتے ہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے' لوگ اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو سقراط یا حضرت عیسیٰ کے ساتھ کیا تھا۔

مذہبی تعلیم دیتے ہوئے سوچنا چاہیے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ اس بات کی اچھی طرح تسلی کر لی جائے کہ روشنی کے نام پر اندھیروں کی تعلیم نہیں دی جائے گی ابھی تک تو آنکھ دینے کے نام پر آنکھوں سے محروم کیا جا رہا ہے۔ تمام اعتقادات کم علمی اور تاریکی پر مبنی ہوتے ہیں' چنانچہ یہ ضروری ہے کہ بچوں کو اعتقادات سے محفوظ رکھا جائے۔

بچوں کو اس لیے محفوظ رکھنا ہے تاکہ وہ بہتر انداز میں گہرائی تک سوچنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں اور ان میں سوچ اور فکر کی قوت کو مضبوط کیا جا سکے۔ انہیں خیالات نہ دیں بلکہ سوچنے کی طاقت فراہم کریں اگر آپ نے انہیں خیالات سے بھر دیا تو یہ ویسا ہی ہو گا جیسے اعتقادات سے بھر دیا ہو۔ دیئے ہوئے خیالات آپ کے ہوں گے جبکہ سوچنے کی طاقت ان کی اپنی ہو گی اگر بچوں میں سوچنے کی طاقت بڑھا دی جائے تو وہ اس بات کے اہل ہو سکیں گے کہ زندگی کے حقائق کو تلاش کر سکیں سوچ راستہ ہے جبکہ اعتقادات راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔

چنانچہ میں کہتا ہوں جو لوگ اعتقادات سے جڑے ہوتے ہیں وہ کبھی غور و فکر نہیں کر سکتے چاہے وہ ہندو ہو' جینا ہو یا کیمونسٹ ہو' اس کے اعتقادات ہی رکاوٹ ہیں چونکہ غور و فکر اس کے اعتقادات کو ختم کرنے کا سبب بن سکتے ہیں اس لیے اس بات کو ترجیح دی جاتی ہے کہ وہ غور و فکر سے دور رہیں۔ یہ اُس کا حفاظتی نظر بٹو ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نظر بٹو نہیں بلکہ خودکشی ہے۔

کیا اعتقادات غور و فکر کے قاتل نہیں ہوتے؟ لیکن یہ قتل جانے یا انجانے طور پر ہو رہے ہیں ایک ہندو باپ اپنے بیٹے کو ہندو بنانا چاہتا ہے اور ایک عیسائی باپ عیسائی اور وہ بھی اس وقت جب بچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ یہ غلط بات اس وقت کی جاتی ہے جب بچے کی عمر چھوٹی ہو' اس چیز کو بعد میں کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ایک بار جب سوچنے کی طاقت آ جاتی ہے تو یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکے۔ غور و فکر کی صلاحیت انسان کو محفوظ رکھتی ہے چنانچہ اس میں کوئی اچنبا نہیں ہونا چاہیے جو نام نہاد مذہبیت اس کے خلاف ہے جو سچ پوچھئے تو وہ لوگ ذہانت کے بھی خلاف ہوتے ہیں کیونکہ جہاں منطق ہو گی وہیں سوچ اور ذہانت کی بغاوت ہو گی۔

بغاوت کا مطلب زندگی کی نئی راہوں کی تلاش ہے۔

بغاوت کا مطلب ایک جانی جگہ سے انجانی جگہ کی طرف سفر ہوتا ہے۔

بغاوت کا مطلب ان سرحدوں سے جنہیں ماضی کی نسل نے قائم کیا ہے۔ ماورائیت کی جانب بڑھنا ہے۔

میرے مطابق بغاوت کی اہلیت مذہبی ذہن کی روح ہے کیونکہ مذہب سے بڑا کوئی انقلاب نہیں ہوتا۔

مذہب زندگی کی جڑوں سے تبدیلی کا نام ہے

چنانچہ یہ ممکن نہیں کہ مذہبی تعلیم کور چشمی اور اعتقادات کی تعلیم میں ہو سکتی ہو اور گہرائیوں تک غور و فکر صرف تعلیم ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے یہ ایک سادہ سی منطق ہے' یہ ایک رخشندہ ذہانت ہے۔

چنانچہ معصوم بچوں کو ذہانت سے عاری تصورات تلے نہیں ڈالنا چاہیے اس کی بجائے ان کی ذہانت کو اس طرح پروان چڑھانا چاہیے کہ وہ اپنی اہلیت کو آزاد اور شعور کی غور و فکر سے آراستہ کر سکیں اور کبھی اسے فروخت نہ کریں' صرف آزاد شعور ہی سچائی کا دروازہ کھول سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آزادی ہی سچائی کا دروازہ ہے۔

اس لیے بچوں کو آزادی دی جائے اور بچوں کے ذہنوں کو احترام آزادی سے روشناس کرائے۔ انہیں چوکس بنائے اور ہر قسم کی ذہنی غلامی سے آگاہ کیجیے' حقیقی مذہبی تعلیم صرف یہی ہو سکتی ہے۔

لیکن مذہبی تعلیم ایسی نہیں دی جا رہی۔ اس میں کور چشمی کی پاسداری ہوتی ہے بجائے دیدہ بینا کے' اس کی بنیادیں دوسروں کے نقش قدم پر چلنا ہوتا ہے بجائے اپنے شعور کے۔

مذہب سوچ سے کیوں خوف زدہ ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ خوف کسی وجہ کے بغیر نہیں۔ بہت ہی اہم اور مضبوط وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر سوچ شعوری اور فعال ہو تو بہت سے مذاہب زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتے۔ مذہبیت تو یقیناً رہے گی لیکن مذاہب یقیناً خطرے میں ہوں گے کیونکہ حقیقی سوچ کائنات کی سچائی کی جانب بہا کرتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے دریا سمندر کی طرف بہتا ہے سارے تفکر کا بہاؤ آفاقیت کی جانب ہوتا ہے۔ غیر جانبدارانہ تلاش کے بعد صرف اور

صرف حقیقت یا سچائی ہی باقی بچا کرتی ہے اور حقیقت یا سچائی ایک سے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ ہمیشہ ایک اور واحد ہوتی ہے' سائنس صحیح سوچ سے آگے بڑھتی ہے' ہندو اور عیسائیوں کی ریاضی الگ الگ نہیں ہوتی۔ عقیدے کے جوہڑ میں بہاؤ نہیں ہوتا وہ خود اپنے میں ساکت ہوتے ہیں اور چونکہ وہ سمندر کی طرف نہیں بہا کرتے اس لیے ایک یا واحد (جو سچائی اور حقیقت ہے یعنی خدا کی ذات) تک پہنچ ہی نہیں سکتے' ان کی اپنی بندش (محصور ہونے کی حالت) انہیں بانٹ دیتی ہے۔

سوچ اور تفکر میں بہاؤ ہوتا ہے' عقیدے میں ٹھہراؤ۔

ایک شخص کی سوچ اور تفکر میں ہمیشہ ماورائیت ہوتی ہے۔

عقیدہ ایک شخص کے اندر محصور ہوتا ہے

چنانچہ جہاں سے بھی سوچ کی ابتداء ہوتی ہے اس کی انتہا بالآخر حقیقت اور سچائی تک پہنچتی ہے جبکہ عقیدہ اتنی دور تک نہیں پہنچ پاتا۔

میں نے سنا تھا کہ جین مت کا ایک جغرافیہ بھی ہے' مذہب میں اس قسم کی ناقابل فہم چیزیں ہوتی ہیں کیا جغرافیہ علیحدہ علیحدہ ہوسکتا ہے؟ ہاں اگر عقیدہ بنیاد ہو تو یہ ہوسکتا ہے۔ جہاں سوچ اور تفکر کی جگہ اندھا اعتماد ہو تو اس قسم کی اختراعی صورت گری ممکن ہوسکتی ہے اور پھر یہ ہر شخص کی جدا جدا ہوگی۔ سچائی اور حقیقت تو ایک ہے لیکن ہر شخص کے خواب الگ الگ ہوں گے۔ یہاں تک کہ اگر دو اشخاص چاہیں بھی تو ان کے خواب ایک جیسے نہیں ہوسکتے۔

ہر شخص کے لیے سچائی صرف ایک ہی ہے کیونکہ وہ ہر ایک شخص کے اندر بیٹھی ہوئی ہے' یہ تصور' خواب یا کسی شخص کا حاصل نہیں۔ ہر شخص کو سب سے پہلے سچائی کو جاننا چاہیے اور اسے دیکھنے کے لیے ایک شخص کو اپنی صحت مند آنکھیں کھولنی ہوں گی' یہ آنکھیں کہاں سے حاصل ہوں گی۔ صرف بھرپور تفکر سے جس پر ذہانت کی کرنیں پڑ رہی ہوں۔

اسی لیے تو میں بار بار کہتا ہوں کہ اگر آپ بچوں کو حقیقت اور سچائی کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں تو انہیں سوچنے کا اہل بنائیں۔ انہیں عقائد سے آزاد کریں اور ان میں ذہانت پیدا کریں۔ ان کی سوچنے کی قوت بیدار ہو کر انہیں دیکھنے کا اہل بنائے گی اور یہی چیز انہیں سچائی کے سمندر تک لے جائے گی جو صرف ایک اور واحد ہے۔

کیا آپ کے علم میں ہے کہ ارستو جیسے شخص نے لکھا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے دانت کم ہوتے ہیں؟ وہ یہ بات کس طرح لکھ سکتا ہے؟ کیا اس کی رسائی کسی عورت تک نہیں تھی جو وہ اس کے دانتوں کو شمار کر لیتا؟ عورتوں کی کمی نہیں تھی بس اس نے مروج یقین کو تسلیم کر لیا پھر کسی قسم کی تحقیق کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کی تو ایک نہیں دو بیویاں تھیں وہ کسی ایک سے کہہ سکتا تھا کہ ذرا اپنا منہ کھولو میں تمہارے دانت گنوں گا لیکن نہیں اسے تو عام اور رائج یقین پر کوئی شبہ تھا ہی نہیں تو وہ سوچتا کس طرح؟ وہ لوگوں کے اندھے یقین کو تسلیم کرتا تھا کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے دانت کم ہوتے ہیں جو سچ پوچھئے تو مردوں کی خود پسندی عورتوں کو کسی معاملے میں اپنے برابر نہیں سمجھتی چاہے وہ دانتوں کا معاملہ ہی کیوں نہ ہو۔ جب ارستو جیسے عظیم شخص کو کوئی شبہ نہ ہو تو پھر کسی دوسرے کو کیونکر ہوسکتا ہے؟ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر تلاش کی ابتداء شبہ سے ہوا کرتی ہے۔

سچائی کی تلاش کا پہلا قدم شبہ ہے مذہبی تعلیم کی اچھی ابتدا یہی ہوسکتی ہے مذہب کی حقیقی بنیاد شبہ ہے' اعتماد و اعتبار یا خوش فہمی نہیں۔

شبہ ابتدا ہے' اعتماد انتہا۔

شبہ تلاش ہے' اعتماد مقصد۔

چنانچہ جو شخص شبہے سے ابتدا کرتا ہے وہ کبھی نہ کبھی مقصد پا لیتا ہے لیکن وہ لوگ جو اعتماد یا اعتبار سے شروع کرتے ہیں وہ کہیں بھی نہیں پہنچتے ہیں ان کے کہیں پہنچنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ انہوں نے بیل کو گاڑی کے پیچھے باندھ رکھا ہوتا ہے ابتدا صرف اسی طرح ممکن ہے جیسے شروع کی جاتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ انتہا' ابتدا سے شروع ہو؟ جہاں اشتباہ نہ ہو' وہاں سوچ اور تفکر نہیں ہوسکتا۔ جہاں تفکر نہ ہو وہاں ذہانت نہیں ہوتی اور جہاں ذہانت نہ ہو تو سچائی بھی نہیں ہوتی۔

مذہب عقیدے کی تعلیم دیتا ہے' اشتباہ اور تلاش کی نہیں۔

مذہب اشتباہ کی تعلیم دے گا تو وہ سوچے اور تلاش کرے گا' اس طرح ایک شخص کو اپنی تلاش ہوگی اور ذاتی تبدیلی اور یہی سچائی ہے۔

سچائی مسلسل تلاش کا نام ہے یہ ایک بھرپور آگاہی کی تحقیق ہے۔ سچائی کی آگاہی کسی

دوسرے کو نہیں دی جاسکتی۔ اسے ایک شخص خود اپنی ذات کے لیے تلاش کرتا ہے۔ سچائی کسی سے مستعار نہیں لی جاسکتی۔ یہ اپنی ذاتی جدوجہد کا پھل ہوتا ہے' مذہب کی تعلیم اسی سچائی کو تلاش کرنے کی تیاری ہے۔

چنانچہ مذاہب کا تعلق جب تک عقائد (Belief) سے ہے اس وقت تک مذہبی تعلیم ممکن نہیں ہوسکتی۔ اس کا نام بے شک مذہبی تعلیم رکھ دیا جائے لیکن وہ صرف ہندو ہو گی یا پھر عیسائی۔ اس قسم کی تعلیم کو مذہبی تعلیم نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس تعلیم کو حاصل کرنے کے بعد لوگ تنگ نظر اور متعصب ہو جاتے ہیں اس طرح بڑا دل و دماغ نہیں پیدا ہوسکتا۔ ایسے لوگ جانبداری کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی ذہانت آزاد نہیں ہوتی بلکہ ختم ہو جاتی ہے ایسے لوگ ذہنی طور پر بوڑھے ہو جاتے ہیں جبکہ تلاش و جستجو کے نتیجے میں دماغ تازہ اور جوان ہو جاتا ہے۔

صرف غیر جانبدار لوگ ہی جوان ہوتے ہیں۔ صرف ایسے ہی لوگ جو جوان ہوتے ہیں وہ اپنے شعور کو سدھار کے نام پر مقید نہیں کرتے۔ ایسے ماحول کا دماغ بوڑھا ہو جاتا ہے اور اسے جتنا سدھارا جائے وہ اتنا ہی بے عقل ہوتا جائے گا۔ کسی صورت حال کو مذہب نہیں کہا جاسکتا صرف ایسا شعور جو ہر قسم کے ملبے سے آزاد ہو وہی مذہب میں داخل ہوسکتا ہے۔

مذہب تمہاری فطرت ہے' تمہارا اپنا۔ سدھار کا تعلق باہر سے ہوتا ہے ویسے ہی جیسے گرد و غبار آئینے کو چھپا دیتا ہے ویسے ہی سدھار شعور کو دھندلا دیتا ہے۔ شعور کے آئینے کو چھپانے کے لیے پہلے سے چلی آنے والی رسم' سدھار' پرانے خیالات یا روایت پسندی' عقائد اور تصورات کو مذہب کے نام پر نہیں قبول کیا جاسکتا۔ اسے ان تمام چیزوں سے آزاد ہونا چاہیے۔ حقیقی تعلیم اور مذہب کی تلاش ایک شخص کو آزادی کے راستے پر چلاتی ہے صرف مذہب ہی ہے جو ہر قسم کی پسماندگی سے ذہن کو آزاد کرتا ہے لیکن وہ مذہب جو بازاروں میں بکتا ہے وہ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ مذہب تعلیم میں داخل ہو اس کے پرانے لباس کو اتار پھینکنا چاہیے۔ یہ نئی نسل کی آتما بن سکتا ہے لیکن اسی وقت جب یہ نئی روح کو حاصل کرے۔

ہمیں اپنی زندگیوں میں مذہب کو یقینی طور پر لانا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر زندگی دشوار اور مجہول ہو کر رہ جائے گی یعنی نامکمل اور بلا توازن اگر ہم صرف باہر کے متعلق سوچتے رہے تو ہمارا اندر یونہی خالی رہ جائے گا اگر ہماری آنکھیں صرف کسی شے پر جم کر رہ جائیں تو ہمیں خدا نہیں

ملے گا یہ ایک مہنگا سودا ہوگا کیونکہ ہم ہیرے کی جگہ پتھر لے رہے ہیں۔ اندر کے مقابلے میں باہر کیا ہے؟ خدا کی دولت کے مقابلے میں دنیا جہان کی دولت کیا حیثیت رکھتی ہے ہمیں جاننا ہوگا کہ ہماری زندگی کا مقصد اور سب کا مرکز کیا ہے ہمیں اپنے اس مرکز کو تلاش کرنا ہوگا کیونکہ مرکز کی تلاش اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک مرکزی نقطے تک نہ پہنچا جائے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ مذہب کا تعلیم سے کوئی تعلق ہو کیونکہ یہ ناکافی ہے ضروری یہ ہے کہ زندگی کا محور بھی تعلیم کا محور ہے۔ نظر آنے والی چیزوں تک ہی زندگی محدود نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دکھائی نہ دینے والی شے اس کی بنیاد ہے۔ جب تک دکھائی نہ دینے والی چیزوں سے واقفیت نہ ہو' اس وقت تک زندگی کا نہ کوئی مقصد ہوگا اور نہ کوئی مفہوم پھر جہاں کوئی مفہوم نہ ہو وہاں سرخوشی اور روحانی سکون کیونکر ہوگا روحانی یا قلبی سکون کو حاصل کرنا ہی مقصد حیات ہے۔

اسی مفہوم یا معنویت کی تلاش مذہب ہے جبکہ سائنس افادی یا سودمند اشیاء کو تلاش کرتی ہے۔ سائنس ہو یا مذہب' دونوں ہی نامکمل ہیں۔ نظامِ فکر میں دونوں کا تناسب ہو تو برگزیدگی اور پوراپن ہوگا۔

انسان کے باہر ایک دنیا ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے اس کے اندر ایک دوسری دنیا بھی ہے باہر کی تلاش دراصل اندر کی تلاش ہے۔ جب ہم باہر کی تلاش میں مصروف ہوں تو اندر کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کیونکہ باہر کی تلاش میں قوت ملتی ہے لیکن سکون نہیں ملا کرتا' دولت ملتی ہے اور روح کا نقصان ہوتا ہے اس دنیا جہان کی کیا حیثیت اگر روح کا ضیاع ہو جائے؟ تمہاری فتح دراصل شکست ہوگی۔

ایک صوفی خاتون تھیں رابعہ (بصری) ایک صبح ان کا ایک دوست ان کی جھگی پر آیا اور کہا ''خوب صورت سورج طلوع ہو رہا ہے اور صبح انتہائی خوشگوار ہے۔''

رابعہ نے جواب دیا ''میرے پیارے دوست میں تمہیں اندر آنے کی دعوت دیتی ہوں کیونکہ میں اس خالق کو دیکھ رہی ہوں جس نے آفتاب کو پیدا کیا اور صبح کو بھی تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم اندر آ جاؤ؟ میں باہر کی خوب صورتی کو اچھی طرح دیکھ چکی ہوں لیکن شاید تم اندر کے حسن سے ناواقف ہو۔''

ایک باہر کی دنیا ہے جو یقیناً خوبصورت ہے وہ لوگ جو دوسروں کو باہر کی دنیا کے خلاف

رکھنا چاہتے ہیں، انہیں نہیں معلوم وہ لوگ جو باہر کی دنیا کی مذمت کرتے ہیں، وہ لوگوں کی اچھائی کے خلاف ہیں۔ باہر کی دنیا حقیقتاً خوبصورت ہے لیکن ایک اندر کی دنیا بھی ہے جو بے حد و حساب حسین اور دلکش ہے جو باہر کی دنیا کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں اپنی تکمیل کو روک دیتے ہیں۔ وہ بہت ہی جلدی اپنا خیمہ لگا لیتے ہیں وہ اس راستے کو بھول جاتے ہین جس پر چل کر منزل پر پہنچا جاتا ہے وہ محل کے دروازے کو فراموش کرتے ہوئے ابتدا میں ہی رک جاتے ہیں انہیں خواب سے بیدار ہو کر چوکس ہونا چاہیے۔ ان کی نگاہوں کو منزلِ مقصود پر ہونا چاہیے اگر یہ بات ایک بار ہو گئی تو وہ اپنا باقی سفر خود کرلیں گے۔

مذہبی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بچوں کے پیش نظر ہمیشہ منزلِ مقصود رہے وہ کہیں راستے میں ہی نہ رک جائیں۔ یہ ضروری ہے کہ اس بات کا علم ہو کہ سائنس صرف اس کو تلاش کرتی ہے جو باہر کی چیز ہے، باہر کی چیز کی تلاش نامکمل عمل ہوتا ہے۔

تعلیم کا تعلق اندرونی تلاش سے متعلق ہونا چاہیے۔

لیکن مذہب جس سے ہم واقف ہیں کبھی اندرونی دنیا کی تلاش نہیں کرتا وہ اندرونی دنیا کی باتیں ضرور کرتے ہیں لیکن وہ کذب بیانی کرتے ہیں کیونکہ ان کے مندر، ان کے گرجا باہر تعمیر کیے جاتے ہیں اور ان کے بت بھی باہر ہی ہوتے ہیں ان کے صحیفے باہر ہوتے ہیں ان کے عقائد بھی باہر ہوتے ہیں۔ باہر وہ آپس میں دست و گریاں دیکھے جاتے ہیں وہ صرف باہر کے لیے مصر ہوتے ہیں اس لیے وہ خود کو اندر نہیں لے جاتے۔

ایک صبح ایک نیگرو کسی چرچ تک پہنچا اور پادری سے اندر آنے کی اجازت چاہی لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ایسا شخص جس کی جلد سیاہ ہو وہ چرچ میں سفید جلد والوں کے ساتھ بیٹھ سکے؟ ایسے لوگ جو اندر کی باتیں تو کرتے ہیں لیکن جلد کے رنگ پر بھی نظر رکھتے ہیں ایسے لوگ جو بات تو خدا کی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ شخص برہمن ہے یا شودر۔ چرچ کے پادری نے جواب دیا ''دوست تم چرچ کے اندر آ کر کیا کرو گے؟ جب تک تمہارا دماغ خالصتاً پرسکون نہ ہو اس وقت تک تمہارا چرچ میں آنا بے کار ہے؟

زمانہ بدل گیا پادری نے اپنی زبان بھی تبدیل کرلی، پہلے وہ کہا کرتا تھا ''جاؤ بھاگو کالے آدمی''، تم چرچ میں کیسے آسکتے ہو؟'' اس نے زبان تو تبدیل کرلی لیکن اس کے دل میں کوئی

تبدیلی نہیں آئی، وہ اب بھی کالے نیگرو کو اندر نہیں آنے دیتا تھا۔

وہ یہ نہیں کہتا تھا۔ ''تم شودر ہو، اس لئے بداعمال ہو، چنانچہ بھاگ جاؤ۔'' وہ کہنے لگا تھا ''دوست، تم اندر آ کے کیا کرو گے؟ تم خدا کو کیسے جان سکو گے جب تک کہ تمہارا ذہن خالص اور پرسکون نہ ہو؟ اس لئے تم جاؤ اور پہلے اپنے ذہن کو صاف کرو۔''

لیکن وہ ایسی کوئی بات سفید جلد والوں سے نہیں کہا کرتا تھا...... جیسے ان تمام لوگوں کا دل سکون کے درجے پر پہنچ چکا ہے۔ صرف نیگروز تھے جنہیں بھگا دیا جاتا تھا۔ پادری دل ہی دل میں ہنستا ہوگا۔ وہ سوچتا ہوگا کہ نیگرو اب کبھی نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس کا ذہن صاف نہیں ہوا ہوگا۔ حقیقت یہی ہے کہ نیگرو واپس نہیں آیا لیکن اس لئے نہیں کہ اس کا ذہن صاف اور پرسکون نہیں ہوا تھا بلکہ نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا ذہن مکمل طور پر پرسکون ہو چکا تھا۔

کچھ دنوں بعد...... تقریباً ایک سال گزر گیا۔ پھر پادری نے دیکھا کہ وہی نیگرو چرچ کے قریب سے گزر رہا ہے۔ اب وہ ایک بالکل مختلف شخص بن چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دوسری دنیا کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے سکون کی خوشبو اور موسیقی اس کے حلقہ بگوش ہو۔ پادری نے سمجھا کہ شاید وہ چرچ میں آ رہا ہے۔ وہ تھوڑا سا گھبرایا ہوا بھی تھا لیکن اس کا خوف بے بنیاد تھا۔ نیگرو نے تو چرچ پر نگاہ تک نہیں ڈالی، یونہی آگے بڑھتا رہا۔

پھر پادری دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اسے روک کر کہا۔ ''دوست تم دوبارہ نہیں آئے؟''

نیگرو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میرے دوست اور راہنما، تمہارا بہت بہت شکریہ میں پورے ایک سال تک تمہارے مشورے پر عملکرتا رہا۔ میں پرسکون ہونے کا انتظار کرتا رہا تاکہ چرچ آسکوں۔ لیکن گزشتہ شب میں نے خواب میں خدا کو دیکھا جس نے مجھے کہا۔ ''تم بے وقوف آدمی! تم مجھ سے ملاقات کے لئے چرچ میں کیوں جانا چاہتے ہو؟ پچھلے دس برسوں سے میں خود چرچ میں جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن پادری مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے رہا ہے۔ جہاں میں نہ جاسکوں وہاں تم کیسے جاسکتے ہو!''

میں کہتا ہوں کہ جہاں خدا چرچ میں نہ جاسکتا ہو اور وہ کس چرچ اور معبد میں نہ جاسکے کیونکہ وہ عبادت گاہیں انسان سے تو بڑی نہیں ہیں۔ یہ عبادت گاہیں اتنی چھوٹی ہیں کہ اس میں

خدا کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جن کا دماغ چھوٹا ہے وہی بے معنی عبادت گاہیں تعمیر کیا کرتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں خود اپنے اندر خدا نہ ملپا رہا ہو انہیں باہر وہ (خدا) کیا ملے گا۔

سب سے پہلے ایک شخص کے اندر ربانی وجود پیدا ہوتا ہے پھر وہ اس کا جلوہ ہر چہار جانب دیکھنے لگتا ہے۔ اپنے علاوہ کوئی راستہ کوئی پل ایسا نہیں جو اس کاملیت کی طرف جاتا ہو۔ ایک شخص کی اپنی ذات ہی اس کے قریب ہوتی ہے۔ چنانچہ ضروری یہ ہے کہ اسے پہلے اپنے اندر تلاش کیا جائے بجائے باہر تلاش کرنے کے۔ جسے الوہیت قریب نہ ملے وہ دور کیسے جا سکتا ہے۔ خدا تو دلوں میں ہوتا ہے کسی عبادت گاہ میں نہیں۔ چنانچہ عبادت گاہوں کو تعلیم سے منسلک نہ کیا جائے۔ اس طرح رابطے پر زور دینا باہر دیکھنا ہے۔

اس طرح کی تلاش اندر پہنچنے کی ایک رکاوٹ ہوتا ہے۔

جب میں یونیورسٹیوں میں عبادت گاہوں کے متعلق سنتا ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔ مجھے اس بات پر بھی ہنسی آتی ہے کہ کیا کوئی شخص تاریخ سے کچھ سیکھ سکتا ہے۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ عبادت گاہوں نے مذہب کا کیا حال کیا ہے؟

جی نہیں، مذہب میں بیرونی رسم و رواج کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر اس رسم و رواج کا کوئی مقصد نہ ہو تو وہ قابل برداشت ہوگا لیکن وہ تو تباہ کن ہیں۔ انسان سے باہر کوئی مذہب نہیں اس لئے انسان سے باہر کی چیز کو اہمیت دینا غیر مذہبیت ہے۔ یہ انتہائی ضروری اور صاف حقیقت ہے کہ اسے ایسا ہی سمجھا جائے جیسے دو اور دو مل کر چار بنتے ہیں۔

خدا کی ایک عبادت گاہ ضرور ہے لیکن اسے اینٹ پتھر سے نہیں تعمیر کرتے۔ جو اینٹ پتھر سے تعمیر کی جاتی ہے وہ ہندو، عیسائی، جینا یا بدھسٹ کی ہوتی ہے۔ لیکن خدا کی نہیں ہوتی۔ جو چیز کسی شخص سے متعلق ہو، خواہ کسی بھی وجہ سے اس کا تعلق خدا سے نہیں ہوتا۔ اس کی عبادت گاہ لاانتہا ہوتی ہے کیونکہ وہ (خدا) خود لاانتہا ہے جس کی کوئی سرحد نہیں۔ اس کی عبادت گاہ کو کسی توضیح کی حاجت نہیں کیونکہ وہ قطعی مکمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادت گاہ صرف اور صرف شعور میں ہو سکتی ہے۔ ایسی کوئی عبادت گاہ آسمانوں پر نہیں بلکہ وہ روح میں موجود ہے۔ اسے بنایا یا تعمیر نہیں کیا جاتا۔ وہ پہلے ہی ہمیشہ کے لئے موجود ہے۔ صرف اس کا غلاف یا پردہ ہٹانا ہے۔

چنانچہ مذہب سے متعلق تعلیم وہ نہیں ہو سکتی جس میں عبادت گاہ تعمیر کی جائے۔ یہ تو مذہب ہوتا ہے جو انسان کے اندر چھپی ہوئی عبادت گاہ کا غلاف یا پردہ ہٹاتا ہے۔ جو کچھ اندر موجود ہے اسے جاننا ہے کیونکہ اس کا ادراک ہی زندگی کا بنیادی انقلاب ہے۔

اگر سچائی کو جان لیا جائے تو زندگی یکسر تبدیل ہو جائے گی۔

ایسی تعلیم جو اندرونی سچائی اور حقیقت یا خدا سے پردہ نہ اٹھا سکے وہ نامکمل اور خطرناک ہے۔

آج تک تعلیم کی ناکامی کی وجہ اس کا غیر مکمل ہونا ہے۔ نوجوان جو یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں وہ کسی صورت حال سے نبٹنے کے اہل نہیں ہوتے۔ زندگی کا مرکز کیا اور کہاں ہے، وہ اس بات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ سچائی کو جانتے تک نہیں۔ سچائی کیا ہے، اچھائی کیا ہے اور زندگی کی خوبصورتی کیا ہے۔ وہ ادنیٰ اور غیر اہم باتوں کو سیکھ کر نکلتے ہیں اور پوری زندگی اس میں گزار دیتے ہیں۔

اس طرح کی زندگی سے مسرت اور روحانی سکون نہیں ملا کرتا پھر آہستہ آہستہ فضول قسم کا خالی پن ان کے دماغ کے گرد جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ زندگی کا بہاؤ اس بے معنی صحرا میں گم ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں ہر چیز کے لئے غصہ اور جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ میں اس غصے کو غیر مذہبی ذہن کی پیداوار کہا کرتا ہوں۔ مذہبی ذہن سے جو کچھ برآمد ہوتا ہے وہ تشکر اور ممنونیت کا حواس (Sense) اور برگزیدگی ہوتی ہے۔ وہ پورے پن کی جانب ممنونیت ہے۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ممکن ہوگا جب زندگی خوشیوں سے پر اور مکمل ہو۔ یہ خوشی اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک کہ ایک شخص خود کو نہ پہچان لے۔

چنانچہ صحیح تعلیم مذہب کے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ جاننا اور زندگی کی بنیاد سے واقفیت، شعور، اخلاقی بلندی، روح، یہ تمام چیزیں مکمل زندگی کے لئے ضروری ہیں۔

مذہب کیا ہوتا ہے؟

انسان کی مکملیت ہی مذہب ہے۔ پھر ہمیں کیا پڑھنا چاہئے؟ کیا ہمیں صحیفوں اور مذہبی اصولوں کی تعلیم دینی چاہئے؟ یا بچوں کو یہ بتانا چاہئے کہ ایک خدا ہے، ایک روح ہے، جنت، جہنم اور آزادی ہے؟ نہیں، قطعی نہیں۔ اس قسم کی تعلیم مذہبی تعلیم نہیں۔ اس قسم کی تعلیم انسان کو اندر

تک نہیں پہنچاتی۔ اس قسم کی تعلیم ایک شخص کو متعصب اور جانبدار بنا دیتی ہے۔ اس قسم کی تعلیم الفاظ پڑھانے کی تعلیم ہے۔ اس سے غلط علم جنم لیتا ہے جو جہالت سے زیادہ خطرناک ہے۔

علم خود اپنے تجربات سے آتا ہے۔ دوسروں سے سیکھا ہوا علم، علم نہیں ہوتا' فریب ہوتا ہے۔ اس قسم کا فریب جہالت کو چھپا دیتا ہے اور علم کی تلاش رک جاتی ہے۔ جہالت، سے آگاہی اچھی ہوتی ہے کیونکہ یہ علم کی تلاش کی جانب بڑھاتی ہے۔ یہ سمجھنا خطرناک ہوتا ہے کہ دوسروں سے سیکھا پڑھا علم حقیقی ہوتا ہے کیونکہ اس طرح حاصل ہونے والا اطمینان ایک شخص کا پاؤں پکڑ لیتا ہے اور آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے۔

میں ایک بار یتیم خانہ گیا...... وہاں ایک سو کے قریب بچے تھے۔ انتظامی عملے کے ایک شخص نے کہا کہ میں بچوں کو مذہبی تعلیم بھی دیتا ہوں۔ پھر اس نے بچوں سے چند سوالات کئے۔ ان سے پوچھا گیا' کیا خدا کا وجود ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ ''ہاں خدا موجود ہے۔'' ان سے پوچھا گیا۔ ''خدا کہاں ہے؟'' انہوں نے جواب میں آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ان سے پھر پوچھا گیا۔ ''روح کہاں ہے؟'' انہوں نے اپنے ہاتھوں کو اپنے اپنے سینوں پر رکھا اور کہا۔ ''یہاں۔''

میں اس ڈرامے کو دیکھ رہا تھا۔ انتظامی عملہ بہت خوش تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں بھی چند سوالات کروں۔ میں نے ایک بچے سے پوچھا۔ ''تمہارا دل کہاں ہے؟'' بچے نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں یہ نہیں پڑھایا گیا۔'' کیا مذہب میں تعلیم اس طرح ہو سکتی ہے؟ اور کیا بتائی ہوئی بات کو دہرا دینا علم ہو سکتا ہے؟ اگر یہ اتنا ہی آسان معاملہ ہوتا تو دنیا کب کی مذہبی بن چکی ہوتی۔

میں نے یتیم خانے کے منتظم سے کہا' بچوں کو جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ قطعی طور پر مذہبی نہیں اس کے برخلاف بچے اپنی پوری زندگی میں طوطے جیسے ہو کر رہ جائیں گے۔ ایک شخص جب مشین کی طرح کہی ہوئی باتوں کو دہراتا رہے تو اس کی ذہانت مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب زندگی میں ایسے سوالات پیدا ہونے لگیں جو انہیں سچائی کی تلاش پر مامور کر رہے ہوں تو ان کی حاصل کردہ تعلیم دہرانے کا عمل شروع کر دے گی اور مطابقت نہ ہونے کے باعث وہ خاموش ہو کر رہ جائے گا۔ تمہاری تعلیم ان کے تجسس کو ختم کر کے رکھ دے گی۔ وہ نہ تو خدا کو

جانتے ہیں اور نہ روح کو۔ سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ بالکل غلط ہیں۔ کیا تم اس بر خود غلط تعلیم کو مذہبی علم یا تعلیم کہتے ہو؟

میں نے منتظم سے پوچھا کہ آیا تمہاری تعلیم بھی ویسی ہی ہے جیسے ان بچوں کی ہے' کیا تم بھی صرف پڑھائی گئی باتوں کو دہراتے رہتے ہو۔ وہ بچے بھی ادھر اُدھر گھومتے پھر رہے ہیں اس طرح جیسے کہ وہ بچہ جس سے میں نے پوچھا تھا کہ اس کا دل کہاں ہے۔ نسل در نسل ہم خالی الفاظ پڑھائے جا رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی علم ہے۔ کیا کبھی سچائی بھی پڑھائی جا سکتی ہے؟ کیا سچائی کو دہرایا یا رٹا جا سکتا ہے؟

مادی دنیا میں اسی کی قدر و قیمت ہے جو پڑھایا جاتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ بھی باہر ہے وہ علم نہیں ہے بلکہ ممکنہ معلومات ہیں۔ لیکن شعور کی دنیا تجربات ہوتے ہیں معلومات نہیں۔

تجربہ ممکن ہے۔ ایک آدمی کر بھی سکتا ہے اور اس تجربے میں زندہ بھی رہ سکتا ہے لیکن اسے پڑھایا نہیں جا سکتا۔ پڑھنا تو ایسا ہی ہے جیسے اداکاری کرنا۔ کیا کوئی شخص محبت کرنی سیکھ سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص سیکھنے کے بعد محبت کرتا ہے تو وہ صرف اداکاری کرے گا۔ اگر محبت کرنا نہیں سیکھ سکتے تو عبادت کرنا کیونکر سیکھ سکتے ہیں؟ چنانچہ خدا کے متعلق' اصولوں کے متعلق' پوجنے اور عبادت کے متعلق جو چیز سیکھی جاتی ہے وہ صرف اداکاری ہوتی ہے۔ عبادت محبت کی انتہائی اعلیٰ قسم ہے۔ جب محبت سیکھی نہیں جا سکتی تو خدا کو سیکھ کر یا پڑھ کر کیسے جانا جا سکتا ہے؟ خدا تو محبت کی انتہا ہے۔

اس طرح سچائی اور حقیقت کوئی نظر آنے والی چیز نہیں ہوتی۔ اس لئے اصولوں کے ذریعے' صحیفوں کے ذریعے اور الفاظ کے ذریعے' جو کچھ جانی پہچانی چیزیں ہیں' سچائی اور حقیقت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ چنانچہ نظر نہ آنے والی چیزوں تک پہنچنے کے لئے' وہ چیزیں جو جانی اور معلوم ہیں' انہیں چھوڑنا ہو گا۔ جب ہم جانی پہچانی چیزوں سے آزاد ہوں گے تو غیر معلوم چیزیں آشکار ہوں گی۔ اس لئے مذہب سیکھنے سے بہت زیادہ بہتر نہ سیکھنے والی چیز ہے۔ مذہب کا عنصر یاد کرنے سے بہت زیادہ یاد نہ کرنے کے لئے ہے۔ ہمیں دماغ میں کسی چیز کو لکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ دماغ میں موجود خیالات کو یکسر ختم کرنا ہوتا ہے کیونکہ دماغ جیسے ہی خالی ہوتا ہے تو وہ آئینے جیسا ہو کر سچائی اور حقیقت کو جاننے کی اہلیت پیدا کر لیتا ہے۔ ہمیں دماغ کو خیالات اور

تصورات کا اسٹور نہیں بنانا چاہئے بلکہ ایک ایسا آئینہ جس میں سچائی کی شبیہہ واضح ہو سکے۔ اسی وقت مذہبی تعلیم تعارف کے بجائے تلاش و جستجو ہو جائے گی۔

مذہبی تلاش و جستجو کی تیاری ہی مذہبی تعلیم ہے۔ مذہبی تعلیم کسی دوسرے مضمون کی تعلیم جیسی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس کا امتحان بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا امتحان زندگی کے دوران ہوتا رہتا ہے۔ زندگی بجائے خود اس کا امتحان ہے۔

خود زندگی کے علاوہ زندگی میں دوسرا کون سا امتحان ہو سکتا ہے؟ اور مذہب بجائے خود زندگی ہے۔

چنانچہ وہ لوگ جن کی سوچ امتحان پاس کرنا ہے اور ان لوگوں نے اس طرح تعلیم مکمل کی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ جو سچ پوچھئے تو جہاں تعلیم کی تکمیل ہوتی ہے وہیں سے اصلی تعلیم کی ابتداء ہوتی ہے کیونکہ زندگی بھی وہیں سے شروع ہوتی ہے۔

پھر ہمیں مذہب میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ہر شخص کے اندر مذہب کے بیج پہلے ہی ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص میں زندگی موجود ہوتی ہے۔ ہمیں ایسے مواقع پیدا کرنا چاہئے جس میں اس مذہبی بیج کی آبپاری ہو سکے اور ان رکاوٹوں کو دور کرنا چاہئے جو اس کی نشو و نما کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو بیج پھوٹ کر خود بخود کونپلیں نکال لیتا ہے اور ایسا کرنے میں خود اس کی اپنی قوت کام کرتی ہے' اس کی اپنی زندگی سے متعلق تعلقات۔ اس کے نمو کو مصنوعی طریقے سے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ پھر وہ کونپلیں پروان چڑھ کر پودا بناتی ہیں۔ جس میں پتیاں' پھول اور پھل آنے لگتے ہیں۔ ہمیں صرف موقع فراہم کرنا ہوتا ہے باقی سب کچھ خود بخود ہوتا رہتا ہے۔

مذہب میں تعلیم یا تعلیم کے ذریعے مذہب کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ اسکول کو ایسا ماحول اور مواقع فراہم کرنا چاہئے جس میں مذہبی بیج پھل پھول سکے۔ اسکول اس کی نشو و نما کی راہوں میں موجود رکاوٹوں کو دور کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ ایسا کرنے کیلئے تین بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

پہلی چیز ہمت یا جرأت ہے۔ سچ کی تلاش اور خدا تک پہنچنے کے لئے ہمت بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمالیہ پر چڑھنے اور بحر الکاہل کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے ہمت اور

جرأت درکار ہوتی ہے لیکن خدا کی تلاش کے لئے تو اس سے بھی زیادہ بڑی اور عظیم جرأت کی ضرورت پڑتی ہے کیونکر خدا سے زیادہ اونچی نہ تو کوئی چوٹی ہے اور نہ اتنا گہرا کوئی سمندر۔ لیکن نام نہاد مذہبی لوگوں میں اتنی ہمت نہیں ہوتی جو سچ پوچھو تو ان کی مذہبیت ایک ایسا پردہ یا نقاب ہوتا ہے جس میں ان کی بزدلی چھپی ہوتی ہے۔ مذہب اور خوف کے پیچھے خدا ہوتا ہے۔ میں تم کو بتانا چاہوں گا کہ ایک خوف زدہ ذہن کبھی مذہبی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بے خوفی بھی مذہبی زندگی ہوتی ہے۔ بے خوفی سے ہی ہمت اور جرأت پیدا ہوا کرتی ہے۔

چنانچہ پہلی بات تو یہ کہ کسی قسم کے خوف کی تعلیم نہیں دینی چاہئے نہ کسی چیز سے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بے خوفی کی تعلیم دینی چاہئے۔ عظیم طاقت' تابنا کی اور روشنی' یہ بے خوفی ہوتی ہے۔ بے خوفی کی اسی چٹان پر مذہب کا معبد تعمیر ہوتا ہے۔

لیکن ہمارے نادنہاد مذاہب خوف کو پروان چڑھاتے ہیں چنانچہ آج تک یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ مذہبی معبد تعمیر ہو سکے۔ کیا خوف کی دلدل پر معبد تعمیر ہو سکتا ہے؟ اور اگر تعمیر ہو گیا تو کیا قائم رہ سکتا ہے؟ جب میں معبدوں اور گرجاؤں میں جاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ لوگ وہاں پھیلے ہوئے خوف سے کانپ رہے ہیں۔ ان کی عبادت نے خوف کی شکل اختیار کر رکھی ہے اور اپنے سامنے موجود خدا کے حضور جھکے ہوئے ہیں۔ یہ خوف کی ہی علامت ہے۔ اس طرح لوگ پریشانیوں میں خدا کی طرف دوڑتے ہیں کیونکہ ایسے موقع پر وہ زیادہ خوف والا ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں آدمی خدا کی طرف بھاگتا ہے کیونکہ وہ مرنے کے قریب ہوتا ہے اور اس سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ ذرا معبدوں اور مندروں میں جا کر دیکھو وہاں ایسے ہی لوگ ہوں گے جو یا تو قریب المرگ ہیں یا پھر مرے جیسے ہیں۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ خوف کی تعلیم دی جائے۔ بے خوفی کی تعلیم دینی چاہئے۔ اسی صورت میں مذہب زندہ لوگوں کیلئے ہو سکتا ہے۔ آخر بے خوفی پڑھانے میں کیا خوف ہے؟ صرف ایک خوف ہے...... کہ جوان لوگ خدا کے منکر نہ ہو جائیں۔ اس خوف کی وجہ یہ ہے کہ خدا کا تصور خوف کے ساتھ نتھی کر دیا گیا ہے۔ لیکن ایسے خدا کے انکار میں قباحت ہی کیا ہے۔ ایسے خدا کو تسلیم کرنا غلط ہے۔

میں چاہوں گا کہ یہ بے خوفی اس حد تک بڑھے' یہاں تک کہ خدا جسے ہم نہیں جانتے وہ

انکار ہو سکے۔ جب ناراستی (UNTRUTH) سے انکار نہ ہو وہاں بے خوفی نہیں ہو سکتی۔ اگر ناراستی سے انکار نہ ہو تو سچائی کی تلاش کیونکر ہو سکتی ہے؟

میرے خیال سے بے خوفی الحاد پیدا کرتی ہے جو خدا پرستی کے دوسرے رخ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے الحاد ضروری ہے۔ الحاد دراصل خدا تک پہنچنے کی سیڑھی ہے۔ ایک ایسا شخص جو خدا کا منکر نہ ہو وہ خدا پرست کیسے ہو سکتا ہے؟ الحاد کے مقابلے میں خدا پرستی زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو الحاد سے خائف ہو اس کی خدا پرستی جھوٹی ہوتی ہے۔ وہ خدا پرست صرف اس لئے ہوتا ہے کیونکہ الحاد سے خوف کھاتا ہے۔ ایسی خدا پرستی کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟

میری نظر میں ایسے منکر خدا کی زیادہ عزت ہے جو بے خوفی کے عالم میں کی جاتی ہے بہ نسبت ایسے خدا پرست کے جس کی بنیاد خوف میں ہو کیونکہ جہاں خوف ہے وہاں مذہب نہیں ہو سکتا اور اور جہاں بے خوفی ہے وہیں مذہب کا دروازہ ہے۔ یہ ایک تجربہ ہے' ایک لذت جو بے خوفی سے الحاد پیدا کرتا ہے۔ اس طرح روح یقیناً اور زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو کفر و الحاد سے قبل ہی خدا پرست بن جائے وہ جھوٹا خدا پرست ہوگا کیونکہ اندرونی الحاد اس کے اندر چھپا رہے گا۔ ایک ایسا شخص جو کفر کو اندر لئے جیتا ہے وہ تجربات اور سوچ کے بعد اس سے جان چھڑا کر آزاد ہو جاتا ہے۔

الحاد کا مطلب ہوتا ہے' نہ تسلیم کرنے کا عرصہ۔ اگر معاشرہ خدا اور مذہب کے خلاف ہے تو یہ انکار بھی الحاد ہے۔ چیزوں کو تسلیم نہ کرنے کا عرصہ' بڑے پیمانے پر تسلیم اور یقین کفر ہے۔ فرد واحد کی شعوری پختگی کے لئے اس طرح کا عرصہ انتہائی قیمتی اور فائدہ مند ہوتا ہے۔ جو اس راستے سے نہیں گزرتا وہ ہمیشہ پختہ شعور کے بغیر رہ جاتا ہے۔ نہ تسلیم کرنے کا راستہ صرف اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب ایک شخص میں جرأت اور بے خوفی ہو۔

عظیم جرأت کیا ہوتی ہے؟ غلط علم کو تسلیم نہ کرنا عظیم جرأت ہوتی ہے۔

اگر تم یہ نہیں جانتے کہ خدا کا وجود ہے' تو اسے تسلیم نہ کرو۔ ممکن ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد تم پر دباؤ ڈالے۔ تمہیں جنت کا لالچ دے یا پھر دوزخ سے ڈرائے' کسی بھی قیمت پر تم اس بات کو تسلیم نہ کرو جسے جانتے ہی نہیں۔ بہتر ہوگا کہ جنت کو چھوڑ دو اور جہنم میں جانے کے لئے تیار ہو جاؤ لیکن یہ مناسب نہیں کہ خوفزدہ ہو جاؤ۔ صرف ایسا ہی شخص جس میں ایسی جرأت ہو'

وہی سچائی کو تلاش کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ایک خوف زدہ ذہن کیا کر سکتا ہے؟ وہ ہر چیز پر یقین کر لیتا ہے کیونکہ وہ خوف میں مبتلا ہوتا ہے۔ الحادی معاشرے میں اس قسم کا آدمی الحاد کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اگر وہ سویت رشیا میں ہے تو الحاد کو قبول کر لے گا۔ ایسا شخص سوسائٹی کا ایک مرا ہوا حصہ ہوگا۔ وہ زندہ شخص نہیں ہوگا کیونکہ فرد واحد کی زندگی صرف بے خوفی سے ہی اجاگر ہوتی ہے۔

ابھی کل ہی ایک شخص نے مجھ سے ملاقات کی۔ اس نے کہا میں روح کی بقائے دائمی پر یقین رکھتا ہوں...... اور اس کے چہرے پر گویا موت کا خوف لکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا تمہارا یہ یقین موت کے خوف کی پیداوار ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ جنہیں موت کا خوف ہوتا ہے انہیں روح کی بقا کے متعلق سن کر سکون مل جاتا ہے۔

اس نے یہ سنا تو گھبراہٹ کا شکار ہو گیا' پھر پوچھا۔ ''کیا اس کا مطلب یہ ہے روح کو بقائے دوام حاصل نہیں ہوتی؟''

میں نے جواب دیا۔ ''اس میں بقائے دوام ہونے یا نہ ہونے کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ ایک شخص جو موت سے خائف ہو وہ کیا روح کو تلاش کر سکتا ہے۔ سچ کی تلاش کے لئے بے خوفی انتہائی ضروری ہے۔''

یہی بات میں تم سے بھی کہنا چاہتا ہوں۔ ایک شخص روح کی بقائے دوام پر اتنا ہی یقین کرتا ہے جتنا وہ موت سے ڈرتا ہے۔ یقین اتنا ہی مضبوط ہوتا ہے جتنا کہ خوف۔ کیا ایسا شخص زندگی کی سچائی جاننے کے لئے کبھی اپنی آنکھیں کھول سکتا ہے؟ سچائی تک پہنچنے کا راستہ کہیں سے بھی نہیں جاتا ہے سوائے بے خوفی کے۔

روح کی بقائے دوام' خوفزدہ ذہن سے ممکن نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مکمل شعوری بے خوفی ضروری ہے۔

ایک خوفزدہ ذہن سچائی نہیں چاہتا۔ وہ تو تحفظ چاہتا ہے۔ ایک ڈرا ہوا ذہن سچائی نہیں چاہتا وہ سکون چاہتا ہے۔ اس طرح وہ ہر اس بات پر یقین کر لیتا ہے جس سے اسے تحفظ اور سکون کا احساس ملے۔ تحفظ' سکون اور یقین سے حاصل کیا ہوتا ہے؟ سچائی اور حق کے علاوہ کہیں بھی تحفظ' آسودہ خاطری' امن و سکون نہیں ہوتا۔ سچائی کو محسوس کرنے کے لئے یہ ضروری

ہے کہ ذہن میں اتنی ہمت ہو کہ غلط تحفظات اور آسودہ خاطری سے جان چھڑالی جائے۔

چنانچہ میرے مطابق جرأت مذہب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ایک استاذ ایک مذہبی پیشوا' کچھ بچوں کو جرأت کے متعلق تعلیم دے رہا تھا۔ بچوں نے پوچھا کہ کوئی مثال دیجئے۔ استاد نے کہا کہ۔ ''فرض کرو ایک پہاڑی رسٹ ہاؤس کے کمرے میں بارہ بچے رہائش پذیر تھے۔ رات شدید خنک تھی' بچے دن بھر کے تھکے ماندے بستروں پر جارہے تھے۔ ان میں گیارہ بچے کمبل اوڑھ کر سو گئے لیکن ایک بچہ کمرے کے ایک کونے میں جھکا ہوا رات کی عبادت کر رہا تھا۔ میں اسے جرأت کہتا ہوں۔ کیا وہ لڑکا باہمت نہیں ہے؟''

پھر ایک لڑکا اٹھا اور کہنے لگا۔ ''فرض کیجئے بارہ عبادت گزار ایک رسٹ ہاؤس میں مقیم ہیں۔ اگر ان میں سے گیارہ عبادت گزار سونے سے قبل کی عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ایک شخص کمبل اوڑھ کے سو جاتا ہے تو کیا وہ ہمت اور جرأت کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے۔''

مجھے نہیں معلوم کہ یہ سن کر عبادت گزار کو کتنی شرمندگی ہوئی ہوگی' مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ لڑکے نے جو منظر پیش کیا اس سے وہ کیونکر بچا ہوگا۔ لیکن مجھے بہر حال ایک بات معلوم ہے...... کہ ایک شخص کی اپنی ذاتی اہلیت ہی جرأت ہے۔ ایک ایسی اہلیت جو آدمی کو دوسرے بہت سے لوگوں سے آزاد رکھے وہی جرأت ہے۔

ایک شخص کا اپنی انفرادیت برقرار رکھنا جرأت مندی ہے۔ ایک شخص کے اندر موجود اعتماد جرأت ہے۔ ہمت و جرأت کا دوسرا نام اعتماد ہے۔

جرأت کے ساتھ آگاہی کی تعلیم دو۔ مذہب میں تعلیم کا یہ دوسرا اہم ترین عنصر ہے۔

اگر آگاہی نہیں ہے تو صرف جرأت تباہ کن ہوگی۔ کیونکہ خود اعتمادی کی بجائے دیوانگی پیدا ہو جائے گی۔ جرأت طاقت ہوتی ہے جبکہ آگاہی آنکھ...... ایک شخص اپنی جرأت کے سہارے چل سکتا ہے لیکن آگاہی کے ذریعے یہ دیکھتا ہے کہ وہ کہاں جارہا ہے۔

تم نے اندھے اور لنگڑے کی کہانی سنی ہوگی۔ جنگل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اندھے اور لنگڑے کو اپنی اپنی زندگیاں بچانی تھیں۔ اندھا شخص دوڑ تو سکتا تھا لیکن دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ایسے جنگل میں جس میں آگ لگی ہوئی ہو۔ اندھا شخص اگر دوڑ لگائے تو یہ ایسا ہی تھا جیسے خود موت کو دعوت دے رہا ہو۔ لنگڑا شخص جو دیکھ تو سکتا تھا لیکن دوڑ کے جان نہیں بچا سکتا تھا۔ ایسی آنکھوں

کا کیا فائدہ اگر ٹانگیں نہ ہوں؟ پھر انہوں نے جان بچانے کا ایک طریقہ سوچ لیا۔ وہ طریقہ کیا تھا؟ قطعی آسان۔ اندھے شخص نے لنگڑے کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔

یہ کہانی اندھے اور لنگڑے کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہانی تو جرأت اور آگاہی کی ہے۔ اگر ایک شخص جنگل میں اپنی جان بچانا چاہتا ہے جس میں آگ لگی ہوئی ہو تو یہ ضروری ہے کہ جرأت کے کندھوں پر بیٹھنے کی آگاہی ہو۔

عام طور پر آدمی لاشعوری کے عالم میں زندگی گزارتا ہے جیسے کہ سو رہا ہو۔ یہ نیند دراصل خود فراموشی کی نیند ہے۔ نیند سے بیداری ممکن ہے اگر شعور بیدار ہو جائے اور خود آگاہی کے ذریعے ادراک میسر ہو جائے۔ بچوں کو تعلیم ان کی شخصیت کو اجاگر کر کے دی جا سکتی ہے۔ ایک شخص کو اس کی پہچان کرا کے اور خود آگاہی پیدا کر کے۔

عام طور پر شعور کا تیر باہر کی جانب اشارہ کر رہا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو جو کچھ باہر ہے صرف اس کا ادراک ہوتا ہے لیکن شعور کا وہی تیر اپنے اندر بھی اشارہ کر سکتا ہے۔ پھر ہمارا تجربہ کیا ہے صرف ہماری اپنی ذات۔ ادراک اور آگاہی سے روشناس ہونے کے بعد وہ ہمیں نیند کی تاریک زندگی سے بیداری کی روشن زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔

دعائیں' دینی نغمے اور موسیقی جو مذہب کے نام پر جاری ہیں وہ ہمیں خود اپنی پہچان کی طرف نہیں لے جاتے بلکہ خود فراموشی تک لے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بے شعوری اور نیند سے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہ سب ذہنی نشہ ہوتا ہے۔

میرا کہنا ہے کہ پورے شعور اور ادراک سے مذہب کی تلاش ہوتی ہے۔ یونیورسٹی اس کی بنیاد اور موقع فراہم کر سکتی ہے کہ وہ آگاہی اور ادراک سیکھ سکیں۔ جسم سے آگاہی ذہن اور روح کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ یہ سب کیا جائے تو رفتہ رفتہ ایک شخص کی زندگی شعور سے لبریز ہو سکتی ہے۔ آگاہ رہنے کی کوشش اور ذہن کی ہر تبدیلی کو مدنظر رکھنے سے ذہن بے مثال طریقے سے بیدار ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہر لمحے باقی آگاہی بھی آخر تک بڑھتی رہتی ہے۔

تیسرا قدم خاموشی ہے۔

مختلف باتیں اور الفاظ ایک شخص کے ذہن میں بھرے ہوتے ہیں جو اس کے کھنچاؤ اور بے آرامی کا سبب ہوتے ہیں۔ سوچ اور تفکرات ذہن کا سکون ختم کر دیتے ہیں۔ خاموشی کا

مطلب ذہنی سکون ہوتا ہے۔ خاموشی اختیار کرنے اور اسی عالم میں رہنے سے دماغ ہمیشہ تازہ اور جوان رہتا ہے اور یکسر خاموشی اختیار کئے رہنے سے دماغ آئینے جیسا ہو جاتا ہے جس میں سچائی منعکس ہونے لگتی ہے۔

ایک بے چین دماغ کیا کر سکتا ہے؟ یہ کیا تلاش کر سکتا ہے؟ وہ خود اس قدر مصروف ہوتا ہے کہ کسی دوسری طرف دیکھنے کی سکت ہی نہیں رکھتا۔ بھرپور سکون، مکمل خاموشی اور بالکل خالی ذہن، سچائی جاننے کی ضروریات ہوتی ہیں اور جب دماغ کی یہ کیفیت ہو تو یہی مراقبہ ہوگا۔

بچوں کو آسودہ ذہن کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔ دماغ کو مکمل طور پر پرسکون اور آزاد رکھنا، دماغ کو پرسکون رکھنے کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دریا میں بہا جائے، تیراکی نہ کی جائے۔ اسی طرح دماغ کی لہروں پر بہا جائے، بجائے اس پر تیراکی کرنے کے۔ ایک کوشش کئے بغیر سعی، ایک شخص کو گہرے سکون میں پہنچا دیتی ہے جس کو انسان کسی دوسری طرح حاصل ہی نہیں کر سکتا۔

زندگی میں کتنے معنی اور لطف وسرخوشی چھپی ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ پرسکون ذہن کے ذریعے عیاں ہوتا ہے۔ اس طرح زندگی کی سچائی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ موجود ہونے کے باوجود ہم پریشان خیالی کے سبب اس سے ناواقف ہوتے ہیں اور جب پرسکون ہوں تو یہ عیاں ہو کر ہمارے روبرو آجاتی ہے۔

مذہب میں تعلیم، تعلیم میں جرأت کا نام ہے یعنی آگاہی اور سکون۔ مذہب میں تعلیم، تعلیم میں بے خوفی ہے یعنی آگاہی اور خیالات سے پاک خاموشی۔ ایک ایسی ہی تعلیم، نئی معاشرت کی بنیادی سنگ میل ثابت ہو سکتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ تم ان باتوں پر ضرور غور کرو گے جو میں نے بیان کی ہیں۔ تمہیں میری کہی ہوئی باتوں پر یقین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں سوچنا اور گہری نظر سے غور کرنا ہے۔

تمہیں اس پر غیر جانبدارانہ غور وفکر کرنا ہے۔

تمہیں اسے تجربات کی کسوٹی پر پرکھنا ہے۔

ہر پرکھ کے بعد سچائی مزید نکھر کر عیاں ہوتی رہے گی۔

بیرونی غلبے سے آزادی کا نام علم ہے

علم وہ ہے جو بیرونی غلبے سے آزاد کرتا ہے۔

آج کی صبح میں تم سے اس موضوع پر چند باتیں کہنا چاہوں گا۔ یہ ایک بہت ہی اچھی کہاوت ہے۔ یہ علم کی فطری تعریف ہے۔ یہ علم کی تعریف کے ساتھ اس کا معیار بھی ہے۔ لیکن شاید تمہیں صورت حال کے دوسرے رخ سے آگاہی نہ ہو۔ ہم بیرونی غلبے سے آزاد نہیں ہیں۔ ہم جو کچھ پڑھتے ہیں وہ صحیح علم نہیں ہو سکتا بلکہ وہ علم غلط ہوتا ہے۔ ہماری زندگی کو یہ نہیں معلوم کہ آزادی کیا ہوتی ہے چنانچہ ہم جن اسکولوں میں پڑھتے ہیں وہ اسکول نہیں بلکہ اسکول کی ضد ہوتے ہیں کیونکہ علم کی اصل تعریف یہ ہے کہ وہ ہماری زندگیوں کو آزادی کی مسرتوں تک پہنچاتی ہے۔

اس علم کو کیا کہنا چاہئے جو ہمیں وہ مسرت بہم نہیں پہنچاتی؟ پوری دنیا میں علم بڑھتا جارہا ہے۔ اسکول، کالجز، یونیورسٹیاں بڑھ رہی ہیں لیکن انسان آزادی سے ہمکنار نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف انسان اور زیادہ غلام، نادرست اور پستی کی جانب بڑھتا جارہا ہے۔

چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ہم سے کچھ بنیادی غلطیاں سرزد ہو رہی ہوں؟ ہو سکتا ہے کہ بڑھتا ہوا علم ہی غلط ہو؟ میں تمہیں بتانا چاہوں گا کہ وہ علم غلط ہے۔ مجھے اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم جو علم حاصل کر رہے ہیں وہ غلط علم ہے کیونکہ آدمی کی روح، اس کے ذریعے آزاد نہیں ہو رہی ہے اس کے برخلاف انسان غلام اور پابجولاں ہوتا جارہا ہے۔ انسان کا شعور روشن ہونے کی بجائے پستی میں گرتا جارہا ہے۔ انسانی زندگی کی طاقت شان الوہیت کی جانب بڑھتی نہیں دکھائی دیتی بلکہ وہ پست ہوتی ہوئی حیوانیت کی طرف بڑھ رہی ہے۔

کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح علم حاصل کرنے والے لوگ واقعی پڑھے لکھے ہیں؟ ہم خوش گمانی کے جذبے کے ساتھ مسلسل اس علم کو پھیلاتے جارہے ہیں۔ اچھے لوگ اپنی عظیم کوششوں کے ذریعے اسکولوں اور کالجوں کی تعداد میں اضافہ کرتے جارہے ہیں تاکہ آدمی پڑھا لکھا ہو جائے۔ لیکن دو ہزار سال کا تجربہ کچھ اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔

ایک طرف علم بڑھ رہا ہے، دوسری جانب آدمی بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرف علم میں اضافہ ہو رہا ہے، دوسری طرف انسانی زندگی کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ ایک طرف انسان کی دانشمندی پروان چڑھ رہی ہے، دوسری طرف انسان کی روح لگتا ہے پست ہوتی جا رہی ہے۔ یقیناً کوئی نہ کوئی بنیادی غلطی ضرور ہے۔ ابتداء میں ہی سمت کے تعین میں کوئی غلطی ہوئی ہے چنانچہ ہم جس جانب بڑھ رہے ہیں وہ کسی قسم کی خوشی نہیں فراہم کر رہی ہے۔

آج کل دنیا میں لوگ بڑی تعداد میں پڑھ رہے ہیں، زیادہ سے زیادہ علم اور بڑی تعداد میں یونیورسٹیاں موجود ہیں، اتنی کہ گزشتہ صدی میں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اتنی ہی ذہنی پریشانیاں دکھ اور بے سکونی بڑھ رہی ہے، اتنی کہ اس سے قبل کی صدی میں نہیں ہوا کرتی تھی۔ موجودہ تعلیم نے آدمی کی زندگی کو تباہ کر رکھا ہے۔ ہم بڑی امید اور اچھے جذبے کے ساتھ اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔ بچوں کی بڑھوتری سے متعلق ہمارے بڑے خواب اور خواہشات ہیں۔ لیکن تعلیم دلانے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مزید نیچے پہنچ گئے۔ ہم اپنی آنکھوں سے یہ مناظر دیکھ رہے ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آدمی سے بڑا کور چشم اور پاگل کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔ آدمی نے اپنے گزشتہ تجربات سے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ اس نے کوئی سبق نہیں حاصل کیا۔

مجھے ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ بدھا ایک بار ایک قصبے میں آیا...... وہاں ایک غریب موچی رہا کرتا تھا جس کا نام 'سوداس' تھا۔ جب سوداس صبح میں بیدار ہوا تو اس کی نظر اپنے گھر کے پیچھے موجود جھیل کے قریب موجود ایک کنول کے پھول پر پڑی جو پوری آب و تاب سے کھلا ہوا تھا حالانکہ یہ اس کا موسم بھی نہیں تھا۔ یہ کنول کھلنے کا موسم نہیں تھا۔ سوداس نے سوچا۔ "اگر میں اس پھول کو لے کر بازار میں جاؤں تو یقین ہے کوئی نہ کوئی شخص اسے ایک روپئے میں خرید لے گا۔ یہ ایک بے موسم کا پھول ہے...... کوئی اسے یقیناً خرید لے گا۔" اس نے پھول توڑا اور مارکیٹ کی جانب چلا، وہ سوچ رہا تھا۔ "مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر ایک روپیہ مل جائے۔" وہ سڑک پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک بہت بڑے آدمی کی گاڑی گزر رہی ہے۔ کنول کے پھول پر نظر پڑی تو امیر شخص نے گاڑی روکی اور سوداس سے پوچھا اس پھول کو کتنے میں فروخت کرو گے؟ سوداس نے مطلوبہ قیمت یعنی ایک روپیہ کا ذکر نہیں کیا، وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بے موسم کا

پھول ہے اور امیر شخص شاید وہی قیمت ادا کر دے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے۔ امیر شخص نے کہا۔ "میں تمہیں پانچ سو سونے کے سکے دے رہا ہوں...... اسے کسی دوسرے شخص کو نہ فروخت کرو۔"

جس وقت امیر شخص یہ بات کر رہا تھا عین اسی وقت بادشاہ کے کمانڈر انچیف نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی اور اسے روک دیا اور سوداس سے کہا۔ "میں امیر آدمی کی پیش کی ہوئی قیمت سے دس گناہ زیادہ دوں گا۔"

سوداس نے کہا۔ "کیا تم لوگ پاگل ہو چکے ہو؟" امیر شخص پانچ سو سونے کے سکے دے رہا ہے اور کمانڈر اس سے دس گنا زیادہ دینے کے لئے تیار ہے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بادشاہ کی سواری آ گئی اور بادشاہ نے کہا۔ "میں اس پھول کی قیمت کمانڈر کی مقرر کی ہوئی قیمت سے دس گنا زیادہ دے کر خرید رہا ہوں۔"

سوداس حیرت زدہ تھا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے کہا۔ "مجھے اس پھول کے عوض ایک روپیہ کی بھی توقع نہیں تھی جبکہ تم لوگ اتنی زیادہ قیمت دینے کے لئے تیار ہو؟ اس کی وجہ کیا ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "تمہیں یہ بات نہیں معلوم کہ یہاں بدھا آیا ہوا ہے اور ہم اس کے استقبال کے لئے جا رہے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ اس بے موسم کے پھول کو بدھا کی خدمت میں پیش کروں۔ کیونکہ اس کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی شخص اس کے قدموں میں کنول کا پھول پیش کرے گا۔ کون ہے جو اس نایاب پھول کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا نہیں چاہے گا؟"

یہ سن کر سوداس نے جواب دیا۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر اس پھول کو فروخت کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں بدھا کی خدمت میں خود یہ پھول پیش کروں گا۔"

بادشاہ نے اسے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ "سوداس، کیا تم پاگل ہو؟" ابھی تک سوداس سوچ رہا تھا کہ امیر شخص، کمانڈر اور بادشاہ پاگل ہو چکے ہیں۔ اب وہ تینوں کہہ رہے ہیں کہ "سوداس پاگل مت بنو۔ تمہاری اور تمہاری نسلوں کی غربت ختم ہو جائے گی اگر تم نے اس پھول کو فروخت کر دیا۔" سوداس نے کہا کہ "میری تمام تر غربت اب ختم ہو چکی ہے۔ میں خود ہی اس

پھول کو پیش کروں گا۔"

سوداس نے قصبے کے اختتام کی جانب چلنا شروع کر دیا جہاں سے توقع تھی کہ بدھا داخل ہوگا۔ بادشاہ' کمانڈر اور امیر ترین شخص سوداس سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے اس انتہائی حیرت انگیز واقعے کا بدھا سے ذکر کیا۔ "آج اس علاقے کے غریب ترین موچی نے اپنے کنول کے پھول کو کسی بھی قیمت پر فروخت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ خود تمہارے پیروں پر اس پھول کو چڑھائے۔"

سوداس نے آ کر بدھا کے قدموں پر پھول ڈال دیا۔ بدھا نے اس سے پوچھا۔ "اے پاگل سوداس تم نے اس پھول کو فروخت کیوں نہیں کر دیا؟ اس سے ملنے والی رقم تمہاری کئی نسلوں کے لئے کافی ہوتی۔"

سوداس نے جواب دیا۔ "میرے آقا' دولت محبت سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتی۔ روح کو پیسوں کے عوض فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک یہ صرف ایک پھول تھا' میں اسے فروخت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس لمحے جب میں نے تمہارے قدموں کے متعلق سوچا تو اسے فروخت کرنے کا کیا سوال تھا۔ میں خود اسے پیش کر سکتا تھا۔ غریب لوگ بھی محبت کر سکتے ہیں۔ غریب لوگ بھی دان دے سکتے ہیں۔ غریبوں کی بھی روح ہوتی ہے۔ برائے مہربانی پھول قبول کر لو۔"

اس کے بعد بدھا نے اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ سوداس پڑھا لکھا نہیں ہے لیکن وہ تعلیم یافتہ ضرور ہے۔ وہ یہ تو نہیں جانتا کہ پڑھتے لکھتے کس طرح ہیں لیکن اس کے باوجود وہ یقیناً جانتا ہے۔"

ایک شاگرد نے بدھا سے پوچھا۔ "آپ کا 'یقیناً جاننے سے کیا مقصد ہے؟"

بدھا نے جواب دیا۔ "وہ شخص جو عظیم قدر و قیمت سے آگاہی رکھتا ہے اور جو ادنیٰ قدر و قیمت کو عظیم قدر و قیمت پر قربان کر دیتا ہے وہی واقعی صاحبِ علم ہے۔ سوداس نے محبت کی خاطر دولت کو ٹھکرا دیا۔"

کیا ہم آج لوگوں کو حقیقی پڑھا لکھا یا صاحبِ علم کہہ سکتے ہیں۔ جو دولت کے لئے محبت کو قربان کر دیتے ہیں؟ کیا ہم آج کل کے لوگوں کو پڑھا لکھا کہہ سکتے ہیں جن کی پوری تعلیم عظیم اقدار کو تباہ کرنے اور ادنیٰ کو گلے لگانے کے لئے ہوتی ہے؟ کیا ہم انہیں صاحب علم کہہ سکتے

تعلیمی انقلاب

ہیں جو ادنیٰ چیزوں کے لئے اعلیٰ چیزوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ جسم کے لئے روح کو فروخت کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں دولت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک زندگی کا کوئی اور سفر نہیں سوائے طاقت اور مرتبہ حاصل کرنے کے اور وہ جن کی زندگی اور ذہن میں کوئی اعلیٰ مقصد ہوتا ہے وہ ادنیٰ اور فضول چیزوں کو چھوڑ دیا کرتے ہیں؟

کیا ایسی تعلیم آزاد کر سکتی ہے؟ نہیں' وہ نہیں کر سکتی۔ ہم اپنے بچوں کو انجینئر' ڈاکٹر' ریاضی داں اور کیمسٹ بنا رہے ہیں۔ لیکن یہ علم نہیں ہے۔ یہ صرف ایک ذریعہ ہے جس سے روزی کمائی جا سکے۔ یہ وہ انتظام ہے جس سے بہتر انداز میں کمائی کی جا سکے۔ ہم اپنے بچوں کو یورپ اور امریکہ بھیجتے ہیں تا کہ مزید تعلیم حاصل کریں اور ایک شخص سمجھتا ہے اس نے کوئی بڑا کام کیا ہے۔ لیکن ہم انہیں پڑھا رہے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ روٹی کیسے حاصل کی جائے...... اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ہم انہیں تعلیم نہیں دے رہے ہیں نہ انہیں تعلیم کے لئے تیار کر رہے ہیں کیونکہ تعلیم کا مطلب ہوتا ہے کہ زندگی میں حقیقی اور اعلیٰ اوصاف پیدا کئے جائیں۔

زندگی میں حقیقی اور اعلیٰ اوصاف کے کیا معنیٰ ہیں؟ اگر یہ چیز پیدا ہوگئی تو آدمی آزاد ہو جائے گا۔ آدمی بھرپور خوشیوں سے ہمکنار ہو جائے۔ زندگی اعلیٰ ترین اقدار اور اوصاف کی جانب بڑھتی ہے اور ادنیٰ بندھن فنا ہوتا رہتا ہے۔

بندھن کسے کہتے؟ زنجیر کیا ہوتی ہے؟ یہ چیزیں ادنیٰ ہوتی ہیں۔

آزادی کیا ہوتی ہے؟ ایک ایسا سفر جو بلندی اور بلندی اور بلندی کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور آدمی ہر دن تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ بلندی کی جانب سفر ہی حقیقی تعلیم ہے۔ کیا ہم کسی کو تبدیلی کا سبق پڑھا رہے ہیں؟ نہیں' ہم تو خود غرضی' فائدہ حاصل کرنا سکھا رہے ہیں۔ فائدہ جو اپنی ذات کے لئے ہو۔ ہم پڑھا رہے ہیں کہ اپنی خواہشات اور ضروریات کو کتنی مہارت سے حاصل کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو حقیقی علم سکھا رہے ہیں۔ اس سے زیادہ بے معنیٰ خیال اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایک پرانے اسکول کے ساتھ سالانہ امتحان میں تین طلباء کو کامیاب قرار دیا گیا۔ بہرحال ان کے اساتذہ کہا کرتے تھے کہ آخری امتحان بھی لیا جائے گا۔ اسکول کا آخری دن آن پہنچا۔ انہیں ان کی اسناد دے دی گئیں۔ کانوکیشن کی تقریب تمام ہوئی لیکن آخری امتحان نہیں لیا گیا۔

طلباء خاموش رہے کہ شاید اساتذہ بھول گئے ہوں۔ انہوں نے اپنی کتابیں اور دیگر سامان باندھا پھر اپنے ٹیچر کے پاس گئے کہ ان کی آخری آشیر باد لے کر رخصت ہوں۔

راستے میں وہ آخری امتحان کے متعلق سوچتے رہے۔ یہ شام کا وقت تھا اور انہیں رات ہونے سے پہلے دوسرے گاؤں میں پہنچنا تھا۔ سڑک ٹوٹی پھوٹی اور ایک جنگل سے ہو کر گزرتی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا' اس علاقے میں خطرناک جانور پائے جاتے تھے۔ انہوں نے ایک تنگ سا راستہ دیکھا جو کانٹوں بھری جھاڑیوں سے پر تھا۔

ایک طالب علم کانٹوں کے اوپر سے کود گیا۔ دوسرا طالب علم سڑک کے پہلو سے ہوتا ہوا کانٹوں والا حصہ عبور کر گیا۔ تیسرے طالب علم نے اپنا ساز و سامان اتارا اور راستے کو صاف کرنے کی غرض سے کانٹوں بھری جھاڑیوں کو اٹھا کر پھینکنے لگا تا کہ راستہ صاف ہو جائے۔

اس کے دوستوں نے تیسرے طالب علم سے کہا۔ ''کیا تم پاگل ہو؟...... اندھیرا بڑھ رہا ہے' ہمیں تیزی سے چلتے ہوئے گاؤں پہنچنا ہے۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ کانٹے ہٹائے جائیں۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے...... جلدی سے چلو۔''

تیسرے طالب علم نے جواب دیا۔ ''اگر دن ہوتا تو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہر گزرنے والے کو کانٹا نظر آ جاتا۔ لیکن ہمارے گزرنے کے بعد اتنا اندھیرا ہو جائے گا کہ کانٹے نہیں دکھائی دیں گے۔ اگر ہم دوسروں کا خیال کئے بغیر کانٹوں کو چھوڑ کر چلےگئے تو ہماری تعلیم بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ میں تو کانٹوں کو راستے سے ہٹاؤں گا...... تم لوگ جا سکتے ہو۔''

اس دوران صاحب بصیرت استاد جو چھپا بیٹھا تھا یکایک آ گیا۔ اس نے راستے میں کانٹوں کو رکھا تھا۔ یہی طلباء کا آخری امتحان تھا۔ استاد نے ان دونوں طلباء سے کہا جو کانٹوں کو عبور کر چکے تھے کہ وہ واپس اسکول چلے جائیں...... وہ آخری امتحان میں فیل ہو گئے تھے۔ صرف ایک طالب علم جس نے کانٹوں کو صاف کیا تھا' آخری امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

ایک شخص جو زندگی کے کانٹوں کو ہٹانا جانتا ہو' وہی حقیقتاً پڑھا لکھا اور سیکھا شخص ہوتا ہے۔ وہ شخص جو دوسرے کے لئے کانٹوں کو ہٹائے گا وہی ایک دن سڑک پر ان کے لئے پھول بکھیرے گا اور وہ شخص جو راستے پر کانٹوں کو دیکھ کر اسے نظر انداز کرتے ہوئے گزرے گا وہ یقیناً دوسروں کے راستے پر کانٹے بکھیرے گا۔

آخری امتحان ہمیشہ محبت کا ہوتا ہے۔ محبت ہی بالآخر اعلیٰ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ زندگی کی بلند ترین چوٹی محبت ہوتی ہے۔ ایوریسٹ...... زندگی کی بلند ترین چوٹی ہی محبت کی چوٹی ہوتی ہے۔

کیا ہمارے تعلیمی نظام میں محبت پڑھائی جاتی ہے؟ ہماری تعلیم تو محبت کو جانتی تک نہیں۔ اس کے برخلاف ہماری تعلیم تو انا کا درس دیتی ہے۔ انا اور محبت' دونوں ایک دوسرے کی مخالف قدریں ہیں۔ جہاں انا ہوگی' وہاں محبت نہیں ہوگی۔ جہاں محبت ہوگی وہاں انا پرستی نہیں ہو سکتی۔ موجودہ تعلیم انا کا درس دیتی ہے اور ہم بچپن سے ہی انا کو صیقل کرنے کا انتظام کرتے ہیں۔

ایک بچہ جب بنیادی کلاس میں آتا ہے تو ہم اس سے کہتے ہیں کہ اول آنا۔ وہ جو اول آتا ہے اسے انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ جو آخر میں ہوتا ہے اسے کوئی انعام نہیں دیا جاتا اور نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اگر ایک کلاس میں تیس بچے ہوں تو ان میں سے صرف ایک اول آ سکتا ہے۔ ایک بچے کی خوشی باقی 29 بچوں کی تکلیف اور دل آزاری کا سبب بنتی ہے۔ یہ ہے تعلیم جسے ہم دے رہے ہیں۔

اول آنے والا خوش اور مسرور ہے' اس لئے نہیں کہ وہ اول آیا بلکہ اس لئے کہ اس نے باقی بچوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ہم تشدد کی تعلیم دے رہے ہیں۔ تشدد کا صرف ایک مطلب ہے۔ اس کے معنی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ دوسروں کی محرومی سے لطف کا تجربہ کیا جائے۔ کوئی اس لئے تشدد سے آزاد نہیں کہ وہ جراثیم سے پاک پانی پیتا ہے یا پھر رات کھانا کھائے بغیر گزارتا ہے۔ تشدد کے معنی بس یہ ہیں کہ دوسروں کی تکلیف سے لطف لیا جائے۔

ہم اپنے بچوں کو کس بات کی تعلیم دے رہے ہیں' یہی نا کہ دوسروں کی تکلیف سے خوش ہوا جائے؟ اگر کسی کلاس میں صرف ایک طالب علم ہو تو وہ اول آئے گا۔ لیکن وہ خوش نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کلاس میں تیس بچے ہوں اور وہ اول آ جائے تو وہ بہت خوش ہوگا کہ اس نے 29 بچوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اگر اس میں تین ہزار بچے ہوں اور وہ اول آ جائے تو اس کی خوشیوں کی انتہا نہیں رہے گی اور اگر تین لاکھ طلباء ہوں تو اس کی سرخوشی بے پایاں ہوگی۔ ملک کا صدر ہونے کی صورت میں جب ملک کی پوری آبادی پیچھے رہ گئی ہو تو وہ شاداں و فرحاں اور پر غرور ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے جو سیاست پر تشدد ہوتی ہے...... کیونکہ یہ اول آنے کی ایک دوڑ ہے۔

مذہب کا ایک اور رنگ ہے۔ علم کی سمت مختلف ہے۔

حضرت عیسیٰ نے فرمایا۔ وہ شخص متبرک اور مقدس ہے جو پیچھے رہنے کی اہلیت رکھتا ہے...... تعجب ہے، آیا حضرت عیسیٰ غلط تھے یا پھر ہم سب لوگ پاگل ہیں...... ہم جو اسکول چلاتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں اور استاد ہیں...... ہم تعلیم دے رہے ہیں کہ متبرک اور مقدس وہ ہے جو اول آتا ہے۔

اول آنے کی دوڑ کسی کو بھی آزادی نہیں دلا سکتی۔ اس کی کچھ بنیادی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جو شخص اس دوڑ میں شامل ہوتا ہے وہ ایک طرح کی کشمکش اور کھنچاؤ کا شکار ہوتا ہے۔ وہ جنگ شروع کر دیتا ہے۔ وہ دوسروں سے دشمنیاں کرنے لگتا ہے اور جو دشمنی پر اتر آئے وہ اس سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ وہ اس سے بندھ کر رہ جاتا ہے۔ صرف وہی جو سب کا دوست ہو آزادی حاصل کر سکتا ہے اور وہی شخص جو کسی سے مقابلہ نہ کر رہا ہو، سب لوگوں کا دوست ہو سکتا ہے۔

چنانچہ دوستی کا مفہوم اس کے علاوہ کیا ہے کہ "میں مقابلے میں نہیں ہوں۔" اور دشمنی کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ "میں مقابلے میں ہوں، یا تم جیتو گے یا پھر میں جیتوں گا۔ صرف یہی ہو سکتا ہے، یا میں، یا تم۔ دونوں ہی کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

ہم مقابلے کی تعلیم دے رہے ہیں اور انتہائی بچپن سے۔ ہم بچوں کے ذہنوں میں مقابلہ، تشدد اور کامیابیوں کا زہر بھر رہے ہیں اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ سارے اسکول ہیں۔ نہیں، یہ تو اسکول کی ضد ہیں۔ خلاف علم کا مرکز۔ یہ ادارے انسان کے ذہن بگاڑ رہے ہیں، انہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ یہاں احساس کمتری پڑھائی جاتی ہے اور پھر آدمی اپنی پوری زندگی پاگلوں کی طرح گزار دیتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ دوڑ پیسے کے لئے ہے یا کسی منصب اور اقتدار کے لئے۔ لیکن ہم دوڑنے کی تعلیم دے رہے ہیں۔ دوڑ کے بخار کی تعلیم اور بخار کبھی کسی کو صحت مند نہیں رکھتا۔

میں نے سنا تھا، ایکبار بنارس کے ایک کتے نے دہلی جانے کا ارادہ کیا۔ جب بہت سارے لوگ دہلی جا رہے ہوں تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ ایک کتے کو بھی دہلی جانے کی خواہش پیدا ہوئی ہو۔ وقت بدل گیا تھا۔ ایک وقت تھا جب لوگ دہلی سے بنارس جایا کرتے

تھے۔ اب لوگ بنارس سے دہلی جانا چاہتے ہیں۔ بنارس کے کتوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا ایک نمائندہ وہاں بھیج دیں۔ اس نے دہلی کے کتے کو پیغام بھیجا کہ اس کے نمائندے کا استقبال کیا جائے اور وہاں کے سرکٹ ہاؤس میں رسرویشن کر لی جائے۔ ان کو بتا دیا جائے کہ اسے پیدل سفر میں ایک ماہ کا عرسہ لگ سکتا ہے۔ کتا شاید ہندوستانی ذہن کا مالک تھا اور پرانے طریقے سے سفر کیا کرتا تھا یعنی پیدل۔

دہلی کا کتا قائد کا انتظار کرتا رہا۔ ان کی روایات تھیں کہ لیڈر کو آگے بڑھ کر استقبال کیا جائے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا اور اب ایک ایسا لیڈر آ رہا تھا جو اسی کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک بڑے استقبالیہ کا اہتمام کیا۔ لیکن ہوا یہ کہ کتا بنارس سے ایک ہفتے کے اندر ہی دہلی پہنچ گیا۔ دہلی کے کتے حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ لیڈر چلا آ رہا ہے لیکن اتنی تیزی سے نہیں کہ کوئی سات دنوں میں دہلی پہنچ جائے۔ دہلی پہنچنے میں کافی دن لگتے ہیں۔ اس وقت زندگی کا اختتام قریب آ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی ان کا قبرستان ہوتا ہے۔ لیکن یہ کتا سات دنوں میں دہلی پہنچ گیا...... یہ تو انسان سے تیز نکلا۔

اس سے پوچھا گیا کہ "تم سات دنوں میں دہلی کیسے پہنچ گئے؟"

کتے نے جواب دیا۔ "مت پوچھو میرے دوستو! یہ ہمارے اپنے رشتہ داروں کا کیا دھرا ہے۔ جیسے ہی بنارس کے کتوں نے الوداع کہا، گاؤں کے دوسرے کتے میرے پیچھے پڑ گئے، میرا تعاقب کرنے لگے اور جب وہ مجھے اپنی سرحد سے نکال دیتے تو دوسرے گاؤں کے کتے میرا پیچھا کرنے لگتے۔ مجھے راستے میں کہیں آرام کرنے کا موقع نہیں ملا ہر جگہ سے بھگایا گیا، کہیں رک نہیں سکا۔ میں کہیں رکے بغیر دوڑتا ہوا دہلی پہنچا ہوں۔ یہ کہنے کے بعد وہ گرا اور مر گیا۔ وہ لوگ جو بغیر رکے دوڑتے رہتے ہیں وہ موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ انہیں زندگی نہیں ملا کرتی۔ بہرحال کتے نے اپنا سفر تو مکمل کر لیا۔ اس میں دہلی تک دوڑنے کے جذبات تھے اور اس کے پیچھے بہت سارے کتے تھے جو دوڑنے پر مجبور کر رہے تھے۔

ہم اپنے بچوں کے ساتھ یہی کچھ کر رہے ہیں۔ "دہلی جاؤ۔" تمہارے ارد گرد موجود لوگ تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ بچپن میں تمہارے والدین تمہارا پیچھا کرتے ہوئے بھگاتے ہیں اور جب بڑے ہوتے ہو تو تمہاری بیوی یہی کام کرتی ہے۔ جب تم بوڑھے ہو جاتے ہو

تمہارے بچے تمہارے پیچھے ہوتے ہیں۔ ''چلو‘ ترقی کرو‘ دہلی جاؤ۔ دہلی پہنچنا ضروری ہے۔ بغیر اس کے زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔''

اس قسم کا بخار ہم اپنے بچوں کے ذہنوں میں بھرتے رہتے ہیں۔ اسی بخار‘ اسی جذبے کے تحت بچہ پاگلوں کی طرح دوڑتا رہتا ہے۔ اسی کو ہم زندگی کی رفتار کہتے ہیں۔ کیا یہ رفتار تمہیں آزادی دلا سکتی ہے؟ نہیں۔ یہ تمہیں موت تک تو پہنچا سکتی ہے لیکن آزادی نہیں دلا سکتی۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ صرف اسی بناء پر مر جاتے ہیں۔ ہم آزاد نہیں ہو پاتے۔ آزادی کا راستہ دوسرا ہوتا ہے۔

صرف وہی تعلیم آزادی دلائے گی جو کامیابی کی امنگ سے پاک اور اس طرح کی امنگ نہ پیدا کرتی ہو۔ لیکن ہماری سوچ یہ ہے کہ اگر امنگ نہ ہوئی تو ہم آگے کیسے بڑھیں گے؟

پہلی یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ آگے رہنے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یاد رکھنے والی دوسری بات یہ ہے کہ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے دیگر طریقے بھی ہیں۔ ایک راستہ تو یہ ہے کہ دوسرے سے آگے رہا جائے‘ دوسرا راستہ یہ ہے کہ خود اپنی ذات سے آگے رہا جائے۔ میں گزشتہ کل جہاں تھا‘ آج وہاں سے آگے جانا چاہئے۔ یہ ایک مقابلہ ہے جو خود اپنی ذات سے ہے‘ کسی دوسرے شخص سے نہیں۔ ہمیں وہیں نہیں رہنا چاہئے جہاں گزشتہ غروب ہوتے ہوئے آفتاب نے ہمیں چھوڑا تھا۔ جب نیا سورج طلوع ہو تو ہمیں خود سے آگے ہونا چاہئے‘ اس طرح کہ اپنی ذات میں تبدیلی لائی جائے۔

اس قسم کی تعلیم آزادی دلا سکتی ہے۔ یہ تمہیں سکھاتی ہے کہ اپنی ذات کو کیونکر تبدیل کیا جائے۔ وہ تعلیم جو تمہیں دوسروں سے مقابلے کا ہنر سکھاتی ہو وہ کبھی آزادی نہیں دلا سکتی۔

ایک انتہائی اہم بات یہ سمجھنا ہے کہ جو لوگ دوسروں کو پیچھے چھوڑنے کے انتظار میں رہتے ہیں‘ وہ زندگی بھر دوڑتے رہتے ہیں اور کہیں بھی نہیں پہنچتے۔ کیونکہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی اس سے آگے دوڑ رہا ہوتا ہے یا وہ آگے آ جاتے ہیں جنہیں پیچھے چھوڑا تھا۔ لیکن ایک ایسا شخص جو اپنی ذات کی تبدیلی میں مصروف ہو تو ایک وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں مزید کسی تبدیلی کی حاجت نہیں ہوا کرتی۔ مہاویرا‘ بدھا‘ کرشنا وہیں پہنچے تھے۔ وہاں پہنچنے والا اپنی ذات میں تبدیلی لا کر ہی پہنچتا ہے۔ اس عظیم کیفیت کا نام الوہی تجربہ ہے۔ ایک عظیم تجربہ‘ آزادی‘ جس کے آگے نہ کوئی

حرکت ہے اور نہ کہیں پہنچنا ہوتا ہے۔

وہ آخری گول کہاں ہے؟ اس آخری گول یا منزل کا نام آزادی‘ حریت یا خود مختاری یا نجات ہے۔ اگر ایک شخص خود اپنی ذات میں ہر طرح کی تبدیلی پیدا کر لیتا ہے تو مزید تبدیل کرنے کے لئے کچھ نہیں رہتا۔ اسی گھڑی آزادی اور حریت ملا کرتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں وہ تبدیلی کے آخری نقطے تک کبھی نہیں پہنچتے۔ کیوں؟ کیونکہ دوسروں کی تعداد بہت بڑی ہے۔ یہ نہ آسان ہے اور نہ ممکن کہ ہر ایک شخص کو پیچھے چھوڑ دیا جائے...... آج تک کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں کر سکا۔ اس میں کچھ راز اور بھید ہیں جس کی وجہ سے کوئی آج تک ایسا کرنے کا اہل نہیں ہو سکا۔ کیا تم نے سنا ہے کہ آج تک کسی نے یہ کہا ہو کہ وہ سب سے آگے ہے اور اس سے آگے کوئی دوسرا نہیں؟ کسی نپولین نے‘ کسی سکندر نے‘ کسی نہرو نے یہ کہنے کی جرأت کی ہو کہ اس سے آگے کوئی دوسرا نہیں۔ یہ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا۔

ایک سائنس دان جس کا نام پیئر (PEARE) تھا وہ گوبر پر رہنے والے بھونسرے پر تجربات کر رہا تھا‘ یہ عجیب قسم کے کیڑے تھے جو ہمیشہ اپنے لیڈر کے پیچھے چلا کرتے تھے۔ وہ جب تک رینگتا تھا‘ دوسرے بھی رینگا کرتے‘ بلا رکے۔ ان کی عادت بھی انسانوں جیسی تھی۔ اس انسانی بیماری کی وجہ سے بہت سارے کیڑے مبتلائے مصیبت ہیں۔ یعنی قائد کے پیچھے پیچھے چلنا۔

پیئر نے ایک گول پلیٹ لی اور دس پندرہ کیڑوں کو اس میں رکھ دیا۔ کیڑے اپنے لیڈر کے ساتھ گول گول گھومتے رہے۔ پلیٹ چونکہ گول تھی اس لئے راستے کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیڈر جب تک نہ رکے دوسرے کیڑے بھی نہیں رک سکتے تھے اور جب تک لیڈر کے ماننے والے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہوں تو لیڈر کیسے رکے؟ یہ تو اس کے لئے شرمندگی کا مقام ہوگا۔ چنانچہ لیڈر چلتا رہتا ہے۔ دوسرے تمام کیڑے بھی چلتے رہتے ہیں۔ سکندر اور نپولین چلتے رہے تو انہیں ماننے والے بھی چلتے رہے۔ اگر لیڈر رکتا ہے تو دوسرے کیڑے اسے ناکام سمجھیں گے اور سوچیں گے کہ ایک دوسرا لیڈر چنا جائے۔ اگر پیچھے چلنے والے رکتے ہیں تو لیڈر انہیں بزدل کہے گا۔

آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیڑے تھک کر بے حال ہو جائیں گے اور مرنا شروع کر دیں گے۔ ایک کے بعد دوسرے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکیں گے کہ ان کے سفر کا کوئی اختتام نہیں ہے کیونکہ یہ سفر گول دائرے میں ہو رہا ہے۔ اگر ہم آدمی پر توجہ سے نظر ڈالیں تو کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا جس نے اپنا سفر مکمل کیا ہو۔ صرف یہی بات یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ انسان بھی ایک ایسے راستے پر چل رہا ہے جو دائرے میں ہے' گول' گول اور گول راستہ۔ ابھی تک ہمارے آگے کوئی نہ کوئی موجود ہے اسی طرح ہمارے پیچھے بھی لوگ موجود ہیں۔ وہ وقت کبھی نہیں آتا جب ایک شخص سب سے آگے ہو یا سب کے پیچھے ہو...... چنانچہ سفر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ تھک ہار کے مر نہ جائے۔ نہ صرف یہ کہ پیئر سائنسداں کا کیڑا بلکہ آدمی بھی اسی طرح تھک کے مر جاتا ہے اور سفر بھی نہیں ختم ہوتا۔ دوسرے مسافر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ کوئی بھی تھک کے گرے اور مرے ہوئے شخص کو بغور دیکھتا تک نہیں کہ کیا وہ بھی اسی سمت میں سفر کر رہا تھا۔ آج تک سفر کے اس مقابلے میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکا اور نہ ہوگا۔ اس سفر کا کوئی اختتام نہیں۔ یہ سفر ایک دائرے میں جاری ہے۔

لیکن ایک دوسرا سفر بھی ہے' اپنی ذات کی برگزیدگی کا سفر یا ماورائے مادہ سفر' جو ہمیشہ اوپر ہوتا رہتا ہے۔ اپنی ذات سے بلند۔ اس کا تعلق کسی سے نہیں ہوتا۔ میں تعلیم اس کو کہتا ہوں جس میں یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ دوسروں سے آگے نکلو۔ ہاں یہ ضرور پڑھایا جاتا ہو کہ خود اپنے اوصاف کو بلند کرو' برگزیدگی حاصل کرو۔ جس دن ایک شخص اپنے اندر برگزیدگی پیدا کرنے کی ابتداء کرتا ہے' اسی دن اس کے سامنے خوشیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ وہ خوشیاں جس سے وہ اب تک ناواقف ہے۔ اس کے برخلاف وہ شخص جس دن سے دوسروں سے آگے رہنے کی ابتداء کرتا ہے' اس کے لئے اسی دن سے اس کی زندگی میں تکلیف اور کھنچاؤ اور بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔

اس بات کو یاد رکھو! دوسروں کو اپنے پیچھے رکھنے پر دباؤ ڈالنا اسے تکلیف پہنچانا ہوتا ہے اور جو شخص دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث ہو اسے کبھی روحانی سکون اور خوشیاں نہیں ملا کرتیں کیونکہ ہم جو کچھ بھی دوسروں کو دیتے ہیں وہ بالآخر ہم تک واپس آ جاتی ہیں۔ زندگی ایک معنی میں عجیب و غریب ہے کہ ہم جو عمل بھی کرتے ہیں اس کی بازگشت ہمیں سنائی دیتی ہے۔

ایک بار میں پہاڑوں پر گیا تھا۔ وہاں بازگشت کا ایک پوائنٹ تھا۔ وہاں جس طرح کی آواز پیدا کی جاتی تھی' اس کی بازگشت سات بار سنائی دیتی تھی۔ ایک دوست نے ایسی آواز پیدا کی جیسے کتا بھونکتا ہے' اس آواز کی بازگشت سات بار سنائی دی' اس طرح جیسے بہت سے کتے بھونک رہے ہوں۔ یہ انتہائی پُرخلل آوازیں تھیں۔ میں نے اپنے دوست سے کہا' کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ کوئی گانا گایا جائے۔ اگر وہ گانا گانا نہیں چاہتا تو کوئل کی آواز پیدا کرے۔ کتے کی طرح بھونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر دوست نے ایک خوب صورت نغمہ چھیڑا اور پھر اس نغمے کی بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی۔

میں نے اپنے دوست سے کہا کہ پوری زندگی اسی بازگشت پوائنٹ کی طرح ہے' اگر کوئی غلط اور بری بات کی جائے تو وہ اسی انداز میں واپس ہو جائے گی اور اگر کوئی نغمہ گایا جائے تو نغمہ واپس ہم تک آئے گا۔ اگر کانٹے پھینکے جائیں تو واپس کانٹے ہی آئیں گے' اگر پھول پھینکے جائیں تو پھولوں کی بارش ہوگی۔

زندگی بازگشت کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں وہی ہم تک واپس ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ پڑھا رہے ہیں کہ دوسروں کو ناخوش ملول اور شکست خوردہ رکھا جائے تو یہی ہم تک واپس آ جائے گا اور زندگی کے آخر میں صرف ثروت ہی رہ جائے گی۔ ثروت کس طرح آزادی تک پہنچا سکتی ہے؟ اس سے صرف جہنم' ناخوشی' دکھ' تکلیف اور محکومی ہی ملے گی۔

یہ حیرت انگیز ہے کہ اگر ہم کسی کے راستے میں کانٹے بچھائیں تو یہ عمل تکلیف کا باعث ہوگا لیکن اگر پھول بچھائیں تو یہ عمل تکلیف کا باعث نہیں ہوگا۔ تکلیف کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم کانٹے بچھاتے ہیں تو وہ لوٹ کر ہماری جانب اسی طرح آتے ہیں یعنی درد اور تکلیف کی صورت میں لیکن جب پھول واپس آتے ہیں تو پھر کوئی دکھ' کوئی تکلیف اور کوئی درد نہیں ہوتا۔

بلاواٹسکی (BLAVATSKY) نے پوری دنیا کا سفر کیا۔ وہ عجیب و غریب عادت کی مالک تھی' ہمیشہ ایک بیگ رکھا کرتی تھی جس میں مختلف قسم کے پھولوں کے بیج موجود ہوتے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتی تھی' خواہ ٹرین ہو یا کار' دونوں جانب پھولوں کی بیج بکھیرا کرتی تھی۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ "یہ موسم برسات ہے' بارش کا پانی بیجوں پر پڑے گا اور وہ پھوٹ کر پودوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ اس میں پھول

کھلیں گے' یہ بہت ہی حسین لگیں گے۔'' لوگوں نے کہا کہ چلو مان لیا کہ پھول کھلیں گے لیکن اس سے اسے کیا ملے گا؟ وہ تو اس راستے پر شاید دوبارہ نہ چلے۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں اپنے چاروں طرف جن کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہوں' ان کے بیجوں کو کسی اور نے بکھیرا تھا جو اس وقت کھلے ہوئے ہیں۔ میں ان لوگوں کی مقروض ہوں جنہوں نے کھلے ہوئے پھولوں کے بیج بکھیرے تھے۔ میں پھولوں کے بیج بکھیر کر ان کا قرض چکاتی ہوں۔ میں تصور کرتی ہوں کہ دوسرے لوگ جو اس راستے سے گزریں گے وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوں گے چاہے میں اس راستے سے دوبارہ نہ گزروں۔ میں تصور میں ان مناظر کو دیکھ کر انتہائی خوشی محسوس کر رہی ہوں۔''

کیا تم نے کبھی تصور کیا کہ کوئی اس درجہ شاداں اس لئے ہے کہ اس نے تمہارے لئے کچھ کیا ہے؟ تم تصور کی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو کہ تمہارے لئے کوئی کام کر کے ایک شخص کتنا مسرور ہے یا پھر کسی کا دل تمہارے عمل سے جل رہا ہے۔

تعلیم ہی ہے جو بالآخر آزادی دلاتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو آدمی کو اس کی روح تک لیجاتی ہے' حقیقت سے قریب یقیناً تعلیم اور اس سلسلے میں تمہاری مدد کون کرے گا؟ کیا دوسرے لوگ؟ نہیں' کوئی بھی تمہارے لئے یہ نہیں کر سکتا۔ روزانہ تمہیں اپنے اندر موجود سونے کو آگ میں دہکا کر صاف کرنا ہوتا ہے' اس طرح کہ اس کی گندگی جل جائے اور خالص سونا رہ جائے۔ ایک شخص اپنی ذات کو مسلسل اٹھا کر بلندیوں تک پہنچتا ہے۔ تعلیم جو اس عمل سے گزارے وہی آزادی دلاتی ہے۔

میں نے تم سے چند باتیں کی ہیں۔ بس ایک بات اور کہنے کے بعد اپنی گفتگو ختم کردوں گا۔ دکھ تکلیف' اندھیرا' نفرت اور تشدد' آدمی کی دنیا میں اس لئے پیدا ہوا کہ ہم نے جھوٹے علم کو علم سمجھ لیا۔ اگر ہم سچ مچ آدمی کی زندگی بدلنا چاہتے ہیں تو جھوٹے علم اور حقیقی علم کے درمیان لائن کھینچنی ہوگی۔ حصولِ زر کے لئے جو تعلیم بھی دی جاتی ہے وہ یکسر غلط ہے اور جو زندگی کی تعلیم ہے...... حصولِ زر کی نہیں بلکہ زندگی...... وہی اصل علم ہے۔

ہمارے پاس دو طرح کے اسکول ہونے چاہئیں۔ غلط اور جھوٹے اسکول جہاں ایک شخص کو کمانے اور کھانے کے طریقے سکھائے جائیں...... کیونکہ بغیر روٹی کے آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔

لیکن صرف روٹی کے ساتھ بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ آج کل ہے اور ہم انہیں غلط اور جھوٹے اسکولوں کو اصل اور حقیقی اسکول کا نام دیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہم اچھے اور خوب صورت لوگوں کے نام ان سے منسلک کرتے ہیں' مثلاً مہاویرا کا نام...... ہم نے ایک اسکول کا نام "MAHAVIRA VIDYALAYA" مہاویرا اسکول رکھ چھوڑا ہے حالانکہ روئے زمین پر ابھی تک کوئی ایسا اسکول نہیں جسے مہاویرا کے نام سے پکارا جائے۔ ابھی ایسا ہونے میں وقت لگے گا۔ اس وقت جتنے اسکول بھی قائم ہیں وہ معمولی لوگوں کے نام سے ہو سکتے ہیں۔ کوئی اسکول بھی مہاویرا کا اسکول نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایسا ہو سکتا ہے' اگر ہم واقعی قائم کریں۔

میری خدا سے دعا ہے کہ کسی دن مہاویرا کا اسکول بھی قائم ہو جائے یا بدھا اور حضرت عیسیٰ کا......

میں تم لوگوں کا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے محبت اور خاموشی سے سنا اور تمہارے اندر چھپی ہوئی الوہیت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ میرے سلام کو قبول کرلو۔

سرکشی کا شعلہ

زرتشت (ZARATHUSTRA) ایک پہاڑ سے نیچے اتر رہا تھا۔ وہ بہت تیزی سے نیچے آ رہا تھا جیسے اس نے کوئی بہت اہم خبر سنی ہو۔ وہ دوڑتا بھاگتا' ہانپتا ہوا زمینی علاقے میں پہنچا اور مارکیٹ میں لوگوں سے پوچھا۔ ''کیا تمنے خبر سنی۔''

لوگوں نے سوال کیا۔ ''کیسی خبر؟''

زرتشت نے کہا۔ ''اتنا بڑا واقعہ ہو گیا اور تمہیں خبر ہی نہیں۔ کیا تمہارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ...... کا انتقال ہو گیا؟''

لوگ کش مکش کا شکار ہو گئے۔ زرتشت نے سوچا کہ شاید وہ بہت جلد یہاں پہنچ گیا ہے' کیونکہ یہ خبر ابھی تک یہاں کے لوگوں تک نہیں پہنچی ہے۔

میں یہ کہانی پڑھ رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ ہم لوگوں تک کوئی اہم خبر نہیں پہنچا کرتی۔ جو لوگ اس قسم کی خبر لاتے ہیں وہ یہی محسوس کرتے ہیں کہ شاید وہ قبل از وقت یا بہت جلد یہاں پہنچ گئے ہیں۔

میں تم سے پوچھنا چاہوں گا کہ ''کیا تم نے یہ سنا ہے کہ بھارت کا دہانت ہو گیا ہے؟''

شاید تمہیں اس خبر سے صدمہ پہنچا ہو گا۔ تمہیں اس بات کی خبر نہیں ہو گی۔ اب ہزاروں برس گزر چکے ہیں' شاید اسی لئے تمہیں اس کا احساس نہیں ہے۔ شاید یہ ایک بہت پرانی خبر ہے اور اس دوران بہت سے واقعات ہو چکے ہیں' شاید اسی لئے تمہیں یاد نہیں رہا کہ تم نے یہ خبر سن رکھی ہے۔ بہر حال میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ انڈیا بہت پہلے ہی مر چکا ہے۔

اقبال اس طرح نغمہ سرا ہوا۔ ''اس میں (انڈیا) کوئی بات ضرور ہے کہ اس کے وجود کا اختتام نہیں ہوا۔'' جب میں یہ نغمہ پڑھ رہا تھا تو خیال آیا کہ وجود کا اختتام تو ہو چکا ہے۔ کیونکہ اگر وجود کا پہلے ہی اختتام ہو جائے تو اختتام کیلئے بچتا کیا ہے؟ اگر ایک آدمی زندہ ہے تو وہ مر سکتا ہے۔ اگر ایک شخص خردمند ہے تو وہ پاگل ہو سکتا ہے۔ اگر ایک آدمی صحت مند ہے تو وہ بیمار ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ایک شخص صحت مند نہیں ہے تو وہ بیمار کیسے ہو سکتا ہے؟

کیا انڈیا کے اختتام نہ ہونے کی یہ حقیقی وجہ ہو سکتی ہے جبکہ وہ تو بہت پہلے ہی اپنی سانس روک چکا ہے؟ اب ہمارے پاس کیا رہ گیا ہے کہ اس کا خاتمہ ہو۔ میں نے اپنی گفتگو کا آغاز اس خبر سے کیا ہے۔

یہ ملک ہزاروں سال پہلے بے جان ہو چکا ہے۔ اس ملک کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک نئی زندگی تلاش کرے۔ نئی زندگی اور روح۔ استاد اس تلاش میں یقیناً مددگار ہو سکتا ہے لیکن ابھی تک تو نہیں ہوا۔ ٹیچر نے ابھی تک یہ ثابت کیا ہے کہ وہ شمع لے کر ہماری زندگی کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ابھی تک تو وہ پرانے اور مردہ معاشرے کا ایجنٹ بنا ہوا ہے۔ ٹیچر نئی نسل کے ذہنوں میں پرانے رسم و رواج' گلے سڑے معاشرے کو بھرنے کا آلہ اور ذریعہ بنا ہوا ہے۔

ٹیچر تو نئی دنیا کی پیدائش میں ایک آلہ اور ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن ابھی تک بنا نہیں۔ چلئے ہم ٹیچر سے متعلق اس حقیقت کو سب سے پہلے سمجھتے ہیں۔

آج تک ٹیچر نے کیا کیا ہے؟ سوسائٹی نے ٹیچر سے کیا کام لیا ہے؟ سوسائٹی کہتی ہے کہ ہم اس سے بچوں کو تعلیم دلانے کا کام لیتے ہیں۔ لیکن غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ تمام پرانی بیماریوں' اندھی تقلید اور جھوٹے علم کو نئی نسل کے ذہنوں میں بھرنے کا کام لیتے ہیں' سوسائٹی کسی انقلابی استاد کو برداشت نہیں کرتی۔ کیونکہ جس دن ٹیچرز انقلابی بن گئے تو ایک نئی سوسائٹی وجود میں آ جائے گی۔ اگر ٹیچرز انقلابی بن جائیں تو پوری سوسائٹی کی تبدیلی کی یہی بنیادی وجہ ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیچرز کو انقلابی ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اسے بہت زیادہ عزت و تکریم دی جاتی ہے' یہ ایک حقیقت ہے لیکن سوسائٹی اس قدر و منزلت کو اسی وقت دیتی ہے جب اس میں سرکشی کی کوئی کرن نہ دکھائی دیتی ہو۔ اگر اس میں سرکشی کی کوئی کرن دکھائی دے جائے تو سوسائٹی اس کا ٹینٹوا دبا دیتی ہے۔

تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ ٹیچرز کی دنیا میں کوئی انقلابی خیال' کوئی نئی بصیرت کوئی نیا انداز پیدا ہی نہیں ہوا۔ سوسائٹی کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ استاد کو کبھی انقلابی نہ بننے دیا جائے کیونکہ یہ بہت بڑا اور طاقتور ترین گروپ ہے اور اس کے ہاتھوں میں نئی نسل کے اذہان اور ارواح ہوتی ہے۔ اگر ٹیچر انقلابی بن گیا تو اس سے پرانی سوسائٹی ختم ہو کر ایک نئی شکل اختیار کر لے گی' کیونکہ یہ ٹیچر ہی ہوتا ہے جو پرانی سوسائٹی کو نئی میں تبدیل کرتا ہے۔ ٹیچر درمیانی

رابطہ ہوتا ہے جس کے ذریعے ماضی مستقبل میں داخل ہوتا ہے۔ ٹیچر بہت کچھ کرسکتا ہے لیکن شاید اسے نہیں معلوم کہ وہی انقلاب کا نقیب ہے۔

آج تک ٹیچر نے اپنی توانائی سے صرف پرانی نسل کے خیالات کو نئی نسل کے ذہنوں میں منتقل کرنے کا کام لیا ہے۔ اسکی بس یہ کوشش رہی ہے کہ پرانے خیالات' اعتقادات کو نئی نسل کے ذہنوں میں بھر دیا جائے تا کہ پرانا تصور نئی نسل کے خون میں رچ بس جائے۔ پرانی سوسائٹی ٹیچر کی قدر ومنزلت اسی باعث کرتی ہے کہ وہی ماضی کو محفوظ رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اس دن جب ٹیچر انقلابی انداز اختیار کرے گا تو ایک نئی سوسائٹی وجود میں آجائے گی اور نئی نسل اپنی نگاہوں کو اوپر اٹھا کر نئی زندگی کی طرف دیکھے گی۔

لیکن استاد انقلابی نہیں ہے اور میرے خیال سے ایک ایسا ٹیچر جس میں انقلابی سوچ نہ ہو وہ قطعاً استاد نہیں اور اسے استاد کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ ایک ٹیچر استاد کیسے ہوسکتا ہے اگر وہ انقلابی نہیں ہے؟ بغیر باغیانہ جذبات کے' آنکھیں علم کی جانب نہیں کھلا کرتیں۔ بغیر سرکش جذبات کے روح اپنے خول سے باہر نہیں آتی۔ بغیر باغی جذبات کے زندگی' زندگی نہیں ہوا کرتی۔

کیا ایک تعلیم ایک علم جس سے روح کی بالیدگی نہ ہوتی ہو تعلیم یا علم کہے جانے کے قابل ہوسکتی ہے؟ یہ ایک بوجھ ہوسکتی ہے' یہ صرف معلومات ہوسکتی ہیں۔ مطالعے کا حصول (Learning) لیکن اصل تعلیم (Education) نہیں ہوسکتی۔ تعلیم کو ایسا ہونا چاہئے جو روح کو تلاش کر سکے۔ لیکن اس طرح یہ نہیں ہوسکتا۔ ٹیچر نے ابھی تک باغیانہ طرز عمل نہیں اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے جو پرانی تباہ حال سوسائٹی زندہ اور سلامت ہے۔ مرجانے اور ختم ہوجانے کے باوجود وہ چیزیں ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

ہندوستان میں یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ انڈیا نے ابھی تک اپنے پرانے اور بوسیدہ لباس کو تبدیل نہیں کیا ہے۔ روح کی تبدیلی کی بات تو عبث ہے۔ ہندوستان کی پوری تاریخ ہی غیر باغیانہ ہے۔ کوئی انقلاب رونما نہیں ہوا۔ جب تک کوئی سوسائٹی کسی انقلاب سے نہ گزرے' اس کی زندگی میں بہاؤ قائم نہیں رہتا' وہ ایک برساتی گڑھا بن کے رہ جاتا ہے اور گل سڑ کر سخت بدبو چھوڑنے لگتا ہے۔ وہ بدبودار کیچڑ بن کے سخت بدبو پیدا کرنے لگتا ہے کیونکہ اس میں بہاؤ

نہیں ہوتا۔ ایک ایسی زندگی بھی ہوتی ہے جو دریا کی طرح بہتی رہتی ہے اور اس کا رخ کسی انجانے سمندر کی طرف ہوتا ہے۔ وہ پہاڑوں' وادیوں اور انجانے میدانی علاقوں سے ہوتی ہوئی اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ ایک زندگی اس دریا جیسی ہوتی ہے جو سمندر کی جانب بہتا ہے اور دوسری زندگی ایک تالاب جیسی ہوتی ہے' اپنے اندر مقید جو کسی جانب متحرک نہیں ہوتی۔

ہندوستانی سوسائٹی کی زندگی ایک تالاب جیسی ہے۔ دریا جیسی نہیں۔ ایک طرح سے تالاب والی زندگی محفوظ ہوتی ہے جو کہیں بھی نہیں جاتی' راستے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا' کسی انجانے راستے پر نہیں چلنا پڑتا' اس میں کوئی ایسا خواب نہیں ہوتا کہ اسے کسی انجانے سمندر کی طرف بہنا ہے' ایسا سمندر جس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تالاب کی زندگی کی اپنی خوشیاں ہوتی ہیں' سب کچھ قریب قریب' بے فکری' متعین جگہ۔ ہندوستان تالاب کی خوشیوں میں مست ہے' اسے کسی دریا کی جدوجہد نہیں کرنی ہوتی۔ ہم لوگ اس خوشی کے عادی ہو چکے ہیں اور ہزاروں برس سے ایک جیسی حالت میں رکے ہوئے ہیں اور کسی خطرے کا سامنا نہیں کرتے۔

یاد رکھو' جو معاشرہ خطرات سے کھیلنا بند کر دیتا ہے وہ آہستہ آہستہ اپنی زندگی کے چراغ کی لو کو مدھم کر دیتا ہے۔ اس کی اندرونی لو صرف اسی صورت میں طاقتور ہوتی ہے جب وہ خطرات کا مقابلہ کرتا ہے۔

نٹشے (NIETZSCHE) نے اپنی میز پر ایک سائن بورڈ رکھا ہوا تھا۔ اس پر صرف دو الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ جب بھی کوئی اس سے سوال کرتا کہ اس کی زندگی کا نچوڑ کیا ہے تو وہ اسی سائن بورڈ کی طرف اشارہ کر دیا کرتا جس پر لکھا ہوا تھا ''خطرات میں زندگی گزاری۔'' حقیقت بھی یہی ہے کہ خطرات سے ہی زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ حفاظتوں کے درمیان جینے سے زندگی کے تجربات نہیں ہوا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ قبر میں لیٹا ہوا شخص ہر طرح محفوظ ہوتا ہے۔ تالات کی زندگی میں خطرات نہیں ہوتے' لیکن اس میں سخت بدبو ہوتی ہے اور گندہ ہو کر سوکھ جاتا ہے۔

ہندوستان سینکڑوں برس سے محفوظ زندگی گزار رہا ہے۔ وہ ایک کمزور خول بنا کر رہ رہا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی دنیا کی وسعتوں میں داخل ہو' میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ کوئی چاند اور

ستاروں کا سفر اختیار کرے۔ ہم اپنے گھروں تک محدود ہیں۔ ہم ان درختوں جیسے ہیں جن کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں، ہم اسی قسم کے انسان ہیں۔ ہم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے۔ ہر بیٹا اپنے باپ کا مقام لیتا رہتا ہے نسل در نسل اور یہ تواتر جاری رہتا ہے، آدمی بدلتا رہتا ہے لیکن سوسائٹی یا معاشرہ وہی رہتا ہے۔

ایک ہزار سال پہلے کا کوئی شخص اگر آج ہندوستان کے گاؤں میں آجائے تو اسے کوئی تبدیلی نہیں محسوس ہوگی، ہر چیز ویسی ہی ملے گی جیسی ہزار برس پہلے تھی۔ اسی صورت حال میں ہم خوش وخرم ہیں، ہمارے لیڈر کہتے ہیں کہ "روم ختم ہوگیا، یونان اور مصر ختم ہوگئے، اسیریا اور بے بیلون کہاں ہیں؟ لیکن ہم ابھی تک قائم ودائم ہیں۔" ہم موجودہ صورت حال سے مسرور ہیں۔ حالانکہ یہ خوشی کی بات نہیں، یہ تو انتہائی توہین آمیز صورت حال ہے۔ موجودہ صورت حال صاف صاف کہہ رہی ہے کہ ہم کسی قسم کی تبدیلی کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ ہم ایک پتھر جیسے ہیں جو گلاب کے پھول کے قریب پڑے ہوئے ہیں۔ گلاب کا پھول صبح کے وقت کھلتا ہے اور سورج کی روشنی میں رقص کرتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ آسمان تک پہنچ جائے۔ شام کے وقت کمھلا کر گر جاتا ہے۔ لیکن اس کے قریب پڑا ہوا پتھر صبح میں جس طرح پڑا ہوا تھا شام کو بھی اسی طرح پڑا رہتا ہے۔ ممکن ہے پتھر سوچتا ہو کہ "دیکھو پھول کمھلا گیا لیکن میں اسی طرح ہوں جیسا پہلے تھا۔ بہت سارے پھول آئے اور چلے گئے لیکن میں موجود ہوں۔" یہ بھی ممکن ہے کہ پتھر فخر محسوس کر رہا ہو، لیکن اسے پھول کی مسرتوں اور لطف کا علم نہیں۔ پتھر تبدیلی کی امنگ کو کیا جانے۔ وہ اس زندگی سے ناواقف ہے۔ پھول کا کھلنا، مرجھانا اور زمین پر گرنا، اس کا اپنا ایک مفہوم اور اسرار ہے۔ پتھر کیا جانے کہ کمھلاتے وہی ہیں جو کھلتے ہیں، صرف وہی گرتے ہیں جو اوپر چڑھتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ صرف وہی مرتے ہیں جو جیتے ہیں۔ اگر تم مرنے سے بچنا چاہتے ہو تو زندگی کو نظر انداز کردو۔ اگر تم گرنے سے بچنا چاہتے ہو تو کبھی اوپر کی طرف نہ بڑھو۔ اگر تمہیں مرجھانے اور کمھلانے سے ڈر لگتا ہے تو پھول کی طرح کبھی نہ کھلو۔ لیکن غریب پتھر یہ سب کیا جانے؟

میں نے سن رکھا ہے: ایک صبح ایک گارڈن میں عجیب وغریب واقعہ رونما ہوا۔ اس میں گھاس کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ پتھریلی دیوار سے محفوظ تھے۔ دیوار کی پناہ میں۔ ان

پھولوں کا واسطہ کبھی طوفان سے نہیں پڑا تھا اور نہ ہی انہوں نے کبھی سورج کی روشنی دیکھی تھی۔ وہ ایک محفوظ زندگی گزار رہے تھے۔ وہ نہ تو بارش سے واقف تھے اور نہ رات میں ستاروں کو جھلملاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ محفوظ ضرور تھے۔ ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ان میں سے ایک گھاس کے پھول کا دماغ مضطرب ہوا۔ اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک گلاب کا پھول آسمان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ "کیا میں گلاب کا پھول نہیں ہوسکتا؟ کیا میں اوپر نہیں بڑھ سکتا؟ اس نے خدا سے دعا کرنی شروع کردی کہ اسے گلاب کا پھول بنادے۔" خدا نے جواب دیا کہ وہ نہیں بن سکتا اور یہ کہ وہ انتہائی محفوظ ہے مزید یہ کہ گلاب کا پھول صبح کے وقت کھلتا اور شام کو مرجھا کر گر جاتا ہے جبکہ وہ کھلتا ہے تو ہفتوں اسی طرح رہتا ہے۔ وہ جلدی نہیں مرجھایا کرتا۔

گھاس کے پھول نے جواب دیا۔ میں سمجھ گیا۔ ہم زیادہ دنوں تک کھلے رہتے ہیں کیونکہ ہمارا کھلنا اعلیٰ درجے کا نہیں ہوتا۔ گھاس کے پھول میں ابتداء سے ہی بہت زیادہ نمی نہیں ہوتی چنانچہ ہم آسانی سے مرجھاتے بھی نہیں۔ نہیں، میں چاہوں گا کہ میں گلاب کے پھول کی طرح کھلا کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری پنکھڑیاں بھی گلاب کے پھول کی طرح مخملی ہوں۔ میں پتھروں کے سائے میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ میں اوپر آسمان کی جانب اٹھنا چاہتا ہوں...... چاہے ایک لمحے کے لئے ہی کیوں نہ ہو...... کچھ بھی ہو میں اوپر بڑھنا چاہتا ہوں۔"

گھاس کے پھول نے پختہ ارادہ کررکھا تھا۔ اس کے پڑوسی پھول نے اسے سمجھانا چاہا۔ "کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟ ہمارے خاندان میں کبھی ایسا نہیں ہوا، ہماری روایات الگ ہیں۔ ہمارا رسم ورواج جدا ہے۔ ہم یہیں زندگی کے دن گزارتے ہیں، پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے۔ ہمارے آباؤاجداد نے بھی آسمانوں کی طرف بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہمارے صحیفوں میں بھی یہ نہیں لکھا ہے۔ یہ کیا دیوانگی ہے! لگتا ہے تم پاگل ہوچکے ہو۔ تم دوسروں کی صحبت میں رہ کر خراب ہوچکے ہو۔ اپنی حدود میں رہو۔ اس جگہ سے نکلنا خطرناک ہے۔ اس طرح تو تم ختم ہوجاؤ گے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ گلاب کے پھولوں کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ ایک دن قبل طوفان آیا تھا جس میں سارے پھول زمیں بوس ہوگئے تھے۔ ایک دن جب بارش ہورہی تھی، پھول کی سب پتیاں رونے لگی تھیں۔ اگر کبھی تیز ہوا چلے تو گلاب کے پودے جڑوں

سے ہل جاتے ہیں جبکہ ہم لوگ خوش اور محفوظ رہتے ہیں۔"

بہر حال گھاس کے پھول نے ان کی ایک نہ سنی اور کہا۔ "نہیں، چاہے ایک دن کے لئے سہی لیکن وہ گلاب کا پھول ہونا چاہتا ہے۔" اور جب کوئی بات ہی نہ مانے تو خدا کیا کر سکتا ہے؟ خدا تو اسی وقت کچھ کرتا ہے جب کوئی متفق ہو۔ اگر تم نہ متفق ہو، تو وہ کوئی مدد نہیں کرتا۔ چنانچہ صبح ہوئی تو گھاس کا پھول، گلاب کا پھول بن چکا تھا۔ جلد ہی سورج طلوع ہو گیا۔ آسمان پر بادل چھا گئے اور تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ سارے گھاس کے پھولوں نے نئے گلاب کے پھول پر چلانا شروع کر دیا۔ "او پاگل پھول، اب تم مرجاؤ گے۔ ایک لمحے کی خوشی کے لئے تم نے اپنے ہمیشہ کے آرام کو ختم کر کے رکھ دیا۔ صرف ایک لمحے کی خوشی کے لئے۔ گلاب کا پھول بن کر۔ تم نے اپنے تحفظ کو ختم کر کے رکھ دیا۔"

اس کے فوراً بعد طوفانی ہواؤں کے ساتھ تیز بارش شروع ہو گئی۔ گلاب کا پتلا پودا ادھر اُدھر ڈولنے لگا اور گلاب کی پنکھڑیاں نیچے گرنے لگیں، یہاں تک کہ اس کی پتیاں گر گئیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد گلاب کے پودے کی جڑیں بھیگ کر کمزور ہوئیں اور اکھڑ کر زمین بوس ہو گئیں۔ وہ مرنے لگا تو ایک گھاس کا پھول جھکا اور کہا۔ "تم پاگل، کیا تمہارا دماغ صحیح ہوا یا نہیں؟ صرف آسمان کے نیچے ایک لمحے کے تجربے کے لئے، تم نے کتنی مصیبت اٹھائی۔"

مرتے ہوئے گلاب کے پھول نے جواب دیا۔ "دوستو، میں نے ان چند لمحات میں جو کچھ جانا ہے وہ پتھروں کی پناہ میں گزاری ہوئی طویل زندگی میں نہیں جانا تھا۔ چند لمحات کے لئے آسمان کی جانب اٹھنا، طوفان سے جدوجہد کرنا...... شاید وہ ایک لمحے کی بات ہو لیکن کھلے آسمان کے نیچے سورج کے رخ پر کھڑا ہونا، اپنی خوبصورت شاخوں کے ساتھ طوفان کا مقابلہ کرنا۔ چند لمحوں کے لئے کھلنا لیکن حقیقتاً کھلنا۔ میں نے جس لطف و سرخوشی کا تجربہ کیا، جو تازگی محسوس کی...... میں خدا کا انتہائی شکر گزار ہوں اور تم پر افسوس ہے کہ تم زندگی کو کبھی جان ہی نہیں سکتے اور جدوجہد کے معنی کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ طوفان مین کس طرح رہتے ہیں۔ تم لوگ محفوظ دیواروں کے پیچھے بیٹھے رہو گے اور بالآخر مرجاؤ گے۔ تمہاری زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ یہ واقعہ سچ مچ رونما ہوا یا نہیں لیکن یہ ضرور لگتا ہے کہ یہی کچھ ہندوستانی لوگوں کی زندگی کے مطابق ہے۔ ہم لوگ تحفظ کے سائے میں زندگی گزارتے ہیں۔ ہم تحفظ

کے رسیا ہو چکے ہیں کہ خطرات کی طرف بڑھنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے۔ پھر بے شک پرانی کیفیت سے مانوس اور محفوظ رہیں۔ نامانوس احساس تحفظ کے خلاف ہے۔ انجانی چیزوں سے خوف آتا ہے۔ غیر مانوس راستہ ہمیں خوف میں مبتلا کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک ایسا راستہ منتخب کر لیا ہے جس پر اطاعت گزاروں کی طرح ہزاروں برس سے گول دائرے میں چل رہے ہیں۔ ہمارے استادوں نے بھی نئی نسل کو اسی پرانے راستے پر چلا رکھا ہے جس پر ہمارے اجداد چلتے رہے ہیں۔

نہیں، اس راستے پر چل کر نیا ہندوستان نہیں پیدا ہو سکتا۔ ہندوستان کے استادوں کو جرأت کیساتھ قدم اٹھا کر اس صورت حال کو ختم کرنا ہوگا اور لوگوں کے شعور کو اجاگر کرنا ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس انجانے راستے پر چلنے میں خطرات ہیں لیکن خطرات سے ڈرنا کیا؟ یہ بہتر ہے کہ نامانوس چیز کے خطرے کا مقابلہ کیا جائے بجائے اس کے کہ جانی پہچانی چیز سے تحفظ حاصل کیا جائے کیونکہ نامعلوم چیز سے معاملہ کرنے میں زندگی کی دلچسپیاں ہیں۔ جس سے زندہ رہنے کو انرجی اور زندگی کو چیلنج کا موقع ملتا ہے۔

اگر ہندوستان کے اساتذہ نئی نسل کو پرانے راستے پر چلنے سے آزاد کر دیتے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ انڈیا میں روح پیدا ہو جائے...... ورنہ نہیں۔ انہیں فیصلہ کرنا چاہئے کہ وہ نئی نسل کو چیلنجز کا، مقابلہ کرنے اور نئے راستے تلاش کرنے میں ان کی ہمت افزائی کریں۔ تا کہ وہ پہاڑوں کو پامال کریں، سمندروں کو عبور کریں اور خلاؤں تک جا سکیں۔ لیکن ہماری تو عادت ہے کہ ہم اپنے بچوں کو تاریکی میں جانے سے بھی روک دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو رات ہو گئی ہے۔ ہم انہیں سمندر اور دریا میں چھلانگ لگانے سے بھی روک دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "کیا ضروری ہے کہ ہم ایورسٹ کو سر کریں؟" ایوریسٹ ہندوستانی ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی ہے جسے مغرب کے لوگ گزشتہ سو برسوں سے سر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کی کوشش میں بہت سے لوگ اپنی جان سے بھی گئے اور ہم لوگ اپنے اپنے غاروں میں بیٹھے ہوئے ان پر ہنس رہے ہیں۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں۔ "تملوگ کیوں اس پر چڑھتے ہو؟ کیا تم لوگ پاگل ہو؟ اس کی بلندی پر برف کے سوا اور کیا چیز ہے؟"

بہر حال ہم یہ جانتے ہیں کہ جن بچوں کو پہاڑ پر چڑھنے سے روکا جاتا ہے اس کی روح نئی بلندیوں تک پہنچنے سے بھی رک جاتی ہے اور وہ دوسری روحوں کو بھی بلندی پر جانے سے روک

دیتی ہے۔

ہزاروں لڑکے ایلپس پر چڑھتے ہیں۔ ہر سال تعطیلات کے زمانے میں بہت سے لڑکے ایلپس پر چڑھتے ہوئے ہلاک ہو جاتے ہیں اور اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے باوجود ان کے والدین اور اساتذہ انہیں چڑھنے سے منع نہیں کرتے، بس انہیں گزشتہ سال مرنے والوں کی تعداد سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ جہاں نوجوان ہوتے ہیں وہاں مہم جوئی اور پہاڑوں پر چلنے کا عمل جاری رہتا ہے۔

سیکڑوں لڑکے اور لڑکیاں رودبار انگلستان (English Channel) عبور کرتے رہتے ہیں جبکہ ہم میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ ہم ایک چھوٹی سی ندی بھی پار کریں۔ ہم پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کتنی گہری ہے اور یہ کہ آیا ہمارے اجداد نے اسے کبھی عبور کیا ہے یا نہیں۔ اگر ہمارے اجداد میں سے کسی نے اسے عبور نہیں کیا تو ہم بھی نہیں کریں گے کیونکہ ہم تو اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ ہم کوئی نئی بات نہیں کرتے۔ اپنی پرسکون زندگی کو خطرات میں کیوں ڈالیں؟ ہماری شخصیت اس طرح خوف میں مبتلا ہے کہ ہم ایک لاش بن کر رہ گئے ہیں۔ وہاں کوئی ایسا راستہ نہیں کہ کوئی نئی بات ہو سکے۔ اگر ہم پرانی دنیا سے پیچھا چھڑا لیں تب ہی کوئی نئی راہ پیدا ہو سکتی ہے۔

ٹیچر کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ انڈیا کو پرانی روایات کے بندھن سے آزادی دلائے۔ استاد کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اس وقت تک قصوروار ٹھہرائے جائیں گے جب تک کہ بچوں کو پرانے خیالات سے آزادی نہیں دلاتے۔ انہیں چاہئے کہ وہ بچوں کو نئے راستوں پر گامزن کرنے کے لئے کوشش کریں۔ نئی چیزوں سے آگاہ کریں، نئی کو گلے لگائیں۔ بچوں کو نامعلوم چیزوں سے دلچسپی لینے کے لئے تیار کریں اور نامعلوم پکار کو سنیں۔

امریکی بچے چاند پر رہنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ لیکن ہندوستانی بچے رام لیلا ڈرامہ دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ راما انتہائی خوب صورت تھا، رام لیلا بھی حسین ہے لیکن آخر اسے کب تک دیکھا جائے گا؟ اب تو راما بھی گھبرا گیا ہوگا کہ "لوگ برسوں سے میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں اور ایک ہی ڈرامہ کئے جا رہے ہیں؟ مستقبل میں اور راما بھی ہوں گے، کیا ہمیں ان کی فکر نہیں ہے؟ اسی طرح دوسرے رام لیلا ڈرامے بھی بنیں گے، صرف اس دنیا

میں ہی نہیں بلکہ چاند، مارس اور دوسرے ستاروں پر۔

لیکن ہمارے لئے تو ماضی ہی سب کچھ ہے، مستقبل میں کچھ نہیں ہوگا...... ہمارا سارا کام ختم ہو چکا۔ تاریخ کا دیوتا دروازے بند کر کے کہیں چلا گیا اور مزید تاریخ نہیں بنے گی۔ اب صرف ایک کام رہ گیا ہے کہ ہم ماضی کی تاریخ پر سوچ بچار کرتے رہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے بھینسیں جگالی کرتے ہوئے ماضی کی تاریخ پر غور وفکر کرتی رہتی ہیں۔ ہمیں کوئی نئی چیز معرض وجود میں نہیں لانا، مستقبل کو نہیں پیدا کرنا، غرض کوئی نئی بات کرنی ہی نہیں۔ ہمارے دلوں میں کوئی خواب نہیں کہ کل ہمیں کیا کرنا ہے؟ اور ہمیں کوئی نئی چیز وجود میں لانا ہی نہیں جس پر ہمارے آباؤ اجداد نے قدم نہیں رکھا؟ ہماری زندگی کا مقصد ومطلب ہے کیا، اگر ہم اپنے اجداد کے نقش قدم پر چلنے کے علاوہ کچھ نیا نہیں کرتے؟

ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اس راستے پر چلیں گے جس پر ہمارے اجداد کبھی نہیں چلے۔ ہم ان مناظر کو دیکھیں گے جنہیں ہمارے بزرگوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہم ایسے سمندری اور ہوائی سفر کریں گے جسے کسی نے نہیں کیا۔ ہم اس زمین پر چلیں گے جس پر آج تک کوئی نہیں چلا۔

لیکن نہیں، ہماری خواہش ہماری امنگ جانے کب کی مر چکی ہے۔ ہم تباہ حال پرانے راستوں کو تلاش کر کے اسی پر چلے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ہندوستان میں نئی چیز کی پیدائش ہوتی ہی نہیں۔ اگر نئی پیدائش نہیں ہوتی تو زندگی میں افسردگی رہے گی۔ ہر شخص ناشاد ہے، تھکا اور شکست خوردہ۔ ہر شخص خدا سے صرف ایک چیز کی دعا کر رہا ہے کہ ہمیں پیدائش کے نئے تسلسل سے آزاد رکھ۔ کچھ لوگ اس زندگی سے چھٹکارا چاہتے ہیں جہاں آزادی ہے؟ ہر زندہ شخص تحفظ اور بچاؤ چاہتا ہے۔ کہاں ہے قید سے آزادی؟ ہم نے زندگی کو تباہ کر کے اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں سوائے اس سے چھٹکارے کے کچھ اور ممکن نظر نہیں آتا۔

پورا ملک افسردگی کا شکار ہے، وہ ناخوش رہنے پر مجبور ہے۔ پرانی دنیا میں رہتے رہتے دماغ افسردہ ہو گیا ہے۔ اگر ہمارے گھر کی دیوار پر کیلنڈر لٹک رہا ہوتا ہے تو ہم ہر گزرے ہوئے دن کو پھاڑ دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر دن پرانے کو ہٹا دیتے ہیں تاکہ اس کے پیچھے جو نیا چھپا ہے عیاں ہو جائے۔ ہندوستان کے ذہن میں نئی تاریخ کبھی نہیں آئی۔ ہمارا کلینڈر ہزاروں سال پرانا ہے۔ اس میں اتنی زیادہ پرانی تاریخیں ہیں کہ نئی تاریخ نہیں دیکھی جا سکتی، چاہے کتنی بھی

کوشش کرلیں۔ ہم نے اپنا پرانا کلینڈر پھینکا ہی نہیں۔ ہمیں یہ کرنا ہوگا تا کہ نئی تاریخیں دیکھی جاسکیں۔

جب ہم کوئی نئی پیدائش دیکھتے ہیں تو ہماری روح خوشی سے ناچنے لگتی ہے' ہم نئے کو خوش آمدید کرتے ہیں۔ ڈانس اور خوشی کی زندگی ہر جانب بکھر جاتی ہے کیونکہ نامعلوم کو جاننے میں بے انتہا دلچسپی ہوتی ہے۔ مانوس کو جانتے ہیں اس لئے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ انڈیا دلچسپی سے خالی ہے اس لئے وہ مرچکا ہے۔ دلچسپی زندگی کی منفرد علامت ہوتی ہے۔

اگر ہم انڈیا کو نئی توانائی فراہم کرنا چاہتے ہیں تو ٹیچر کو انتہائی اہم کام سرانجام دینا ہوگا۔ شاید اس سے زیادہ اہم کام کوئی دوسرا نہ ہو اور کوئی دوسرا شخص اس کام کو نہیں کرسکتا۔ سوسائٹی کا کوئی دوسرا طبقہ یہ انقلاب برپا نہیں کرسکتا۔ یہ استاد ہے جسے اپنا ذہن صاف کرلینا چاہئے کہ وہ بچوں کو ماضی کے بوجھ تلے نہیں دبنے دے گا۔ اس سے قبل کہ یہ بات ہو اس وقت تک ان کے اندر اس بیج کی آبیاری کرتے رہیں۔ اس سے قبل کے پرانے بوجھ کا احساس ان میں اجاگر ہو' نئی زندگی کی موسیقی کا اہتمام کیا جائے تا کہ وہ سنتے رہیں۔ اس سے پہلے کہ پرانی دھنوں سے ان کا دماغ بوجھل ہو' نئی دھنوں کو ان تک پہنچائیں تا کہ وہ نئی کی تلاش میں متحرک ہوجائیں۔

یہ بہت ضروری ہے کہ ہندوستان کے بچوں کو ان کے والدین سے بچایا جائے۔ یہ کچھ عجیب سی بات تو ہے لیکن ایسا ہی ہے۔ یہ کام کون کرے گا؟ والدین بچوں کو اپنی شکل وصورت میں ڈھال رہے ہیں۔ اس کام کی تکمیل تک وہ مریں گے بھی نہیں۔ جب والدین محسوس کرتے ہیں کہ بچے ان کے مطابق ڈھل چکے ہیں تو دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ ہر نسل یہی کچھ کررہی ہے۔ ڈھالنے کے لئے پرانے سانچے تیار رہتے ہیں۔ ہر نیا بچہ اسی پرانے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس کی روک تھام کون کرے گا؟ بچوں کو ان کے والدین سے کون بچائے گا؟ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو یہ ملک نئی تہذیب کا احیا نہیں کرسکے گا۔

استاد بچوں کو ان کے والدین سے بچاسکتے ہیں' لیکن ٹیچر کو اس بات کی آگاہی نہیں ہے۔ ٹیچر کو اس کا احساس ہی نہیں ہے۔ وہ تو بچوں کے والدین کا ایجنٹ بنا ہوا ہے استاد انہی کے لئے کام کرتا ہے۔ والدین چونکہ انہیں تنخواہ دیتے ہیں اس لئے وہ ان کے ڈھانچے کے مطابق بچوں کو ڈھالنے میں مدد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو یہ برخود غلط دائرہ قائم ہوا ہے۔ اسے کس طرح

توڑا جائے؟ اس بارے میں کسی نہ کسی کو جرأت کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ ایسا کرنے میں مشکلات ضرور ہوں گی کیونکہ سوسائٹی ایسے لوگوں کا احترام نہیں کرتی۔ لیکن کسی نہ کسی کو اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ورنہ اس ملک میں نئی تہذیب نہیں آسکے گی۔

ٹیچر کے علاوہ' مجھے کوئی دوسرا اس کام کے لئے نظر نہیں آتا۔ سیاستدانوں سے اس بات کی توقع غلط ہے۔ ان سے کسی بات کی توقع بالکل غلط ہے۔ اگر اچھے دن آئے تو سیاستدانوں کے دماغ کا علاج کرانا ہوگا۔ یہ اگر زیادہ ہے تو بھی ٹھیک ہے لیکن ان سے کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ اگر ہر شہر سے سیاستدانوں کو گرفتار کرکے علاج کے لئے بھیج دیا جائے تو یہ دنیا مختلف ہوجائے گی۔ ان سے کسی اچھائی کی توقع نہیں کی جانی چاہئے۔ ہاں اگر مارس ستارے سے لوگ آجائیں تو شاید یہ ممکن ہوسکے۔ لیکن سیاستدانوں سے کوئی امید نہیں۔ کیونکہ وہ سارے امراض کے ایجنٹ ہیں اور ہمارے امراض سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہماری کمزوریوں کو انہوں نے اقتدار میں آنے کے لئے زینہ بنا رکھا ہے۔ ان سے کسی اچھائی کی توقع عبث ہے۔ ان کے لئے ہماری کمزوریاں ایک سیڑھی ہے۔ ہماری کمزوریاں ان کا راستہ ہیں اور ہماری جہالت' اندھا اعتماد اور بے وقوفیاں ان کا زینہ ہیں۔

پھر کون مددگار ہوسکتا ہے؟ کیا سادھو اور سنیاسی؟ نہیں' ایک وقت تھا جب وہ انقلابی ہوا کرتے تھے۔ وہ وقت گزر چکا۔ اب سادھو اور سنیاسی انقلابی نہیں۔ ایک وہ وقت تھا جب بدھا' مہاویرا' شنکرا اور حضرت عیسیٰ جیسے لوگ ہوا کرتے تھے۔ وہ دن تمام ہوگئے۔ اب سادھو اور سنیاسی سوسائٹی کے ملازم ہیں۔ سوسائٹی انہیں کھانا دیتی ہے' اور وہ انہی کے گیت گاتے ہیں۔ وہ اس سے بہتر نہیں رہے۔ ان سے بھی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اب صرف لوگوں کا ایک ایسا طبقہ رہ گیا ہے جس نے ابھی تک کچھ کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی ہے۔ یہ طبقہ پڑھے لکھے ٹیچرز کا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا طبقہ ہے جس کے پاس بے پناہ طاقت ہے۔ ان کی سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ نئی نسل ان کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے قبل کہ نئی نسل ناقابل اصلاح ہوجائے' استادوں کو نئی سمت دکھانی چاہئے۔ نئی آگاہی' نئی نسل کیلئے۔ انہیں خبر نہیں کہ ان کے ہاتھوں میں کتنی عظیم قوت ہے۔ اگر زندگی کی تبدیلی کے نئے اصول طلباء کے ذہن میں ڈال دیئے جائیں تو پورا ملک بیس برسوں میں تبدیل ہوجائے گا۔ کیونکہ بیس برسوں میں پرانی نسل' نئی نسل کے لئے راستہ چھوڑ دے گی۔ ہزاروں سال کی گند صرف بیس برسوں میں صاف کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ

کام صرف اور صرف استاد کر سکتا ہے اور کوئی دوسرا نہیں۔

سب سے پہلے ٹیچر کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ پرانی بیماریوں کو نئی نسل تک پہنچا کر ایک بڑے جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ پرانی نسل نے اپنے اوپر ہندو مسلم کا لیبل لگا رکھا ہے۔ اگر ٹیچر بچوں کو یہ پڑھاتا ہے کہ ''تم ہندو ہو'' یا ''تم مسلم ہو'' تو وہ بڑا جرم کر رہا ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ بچوں کو یہ پڑھائے کہ ''تم سب بنی نوع انسان ہو نہ مسلم ہو نہ ہندو۔'' اسی وقت ایک نیا ملک معرض وجود میں آئے گا۔ اگر پرانی نسل یہ پڑھا رہی ہو کہ ''تم برہمن ہو یا سدھرا ہو'' اور اس بات کو استاد بھی کنفرم کر دے تو پھر وہ پرانی نسل کا ایجنٹ ہے۔ اس طرح اس کے ذریعے بیماریوں کا تسلسل جاری رہے گا۔ وہ اسے نہیں روک سکے گا۔

بنی نوع انسان ہونا کافی ہے۔ اگر نئی نسل اس بیماری کو سمجھ لیتی ہے تو ہزاروں سال پرانی بیماری بیس برسوں میں ختم ہو سکتی ہے۔ اس تبدیلی کو روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن ٹیچر نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

ہم لوگ ماضی کے دلدادہ ہیں۔ بچوں کو ماضی کی دلدادگی سے بچانا چاہئے۔ ویسے بچے پرانے ماضی سے دلچسپی بھی نہیں رکھتے۔ نئی چیزوں کو جاننے کی انہیں شدید خواہش ہوتی ہے لیکن ہم انہیں بہ زور پرانی چیز کو قبول کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ہر دن انہیں ایک نیا سبق پڑھانا چاہئے۔ جرأت' حوصلہ مندی' خطرات سے مقابلہ کرنا' یہ سب خوبیاں ہیں جو اگر آنے والی نسلوں کے ذہنوں میں استاد بٹھا دیں تو ایک بڑا کام ہو جائے گا۔

لیکن اب تک جو ڈھانچہ تعمیر کیا گیا ہے اس کے باعث بچہ معذور ہو کر رہ گیا ہے کیونکہ وہ الجھن کا شکار ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ کیا کرنا ہے۔ ادھر ٹیچر کو بھی نہیں معلوم کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے اور سوسائٹی کے وہ لوگ جنہیں اس بارے میں غور و فکر کرنی چاہئے' وہ بھی نہیں جانتے کہ کیا کیا جائے۔ بے کلی تو ہے لیکن کوئی صاف اور واضح راستہ نہیں۔ اس سلسلے میں سوچ بچار کی جانی چاہئے کہ کیا' کیا جانا چاہئے' کیا چیز ممکن ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاتھوں میں آج بڑا سنہری موقع ہے کیونکہ ہندوستانی بچوں کے ذہنوں میں آج کل جتنا انحراف ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ اگر ٹیچر ان منحرف بچوں کو صحیح راستے پر لگا دے تو پرانی گندگی کو نذر آتش کیا جا سکتا ہے۔ بغاوت کی اس انرجی سے نئی دنیا تعمیر کی جا سکتی ہے۔

لیکن ٹیچر بچوں میں پیدا ہونے والے باغیانہ جذبے کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس انرجی کو کام میں لانے کا اہل ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹیچر خود بھی اس سے خوف زدہ ہے اور اس کی کوشش ہے کہ بچوں کے اس باغیانہ جذبے کو ہر طرف سے ختم کر دے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ ایک بڑی غلطی کا ارتکاب کر رہا ہے۔

بچوں کے باغیانہ جذبے کو ختم نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے صحیح سمت پر ڈالا جا سکتا ہے۔ ان میں جو باغیانہ جذبہ پیدا ہوا ہے' جو روح بیدار ہوئی ہے...... وہ پتھراؤ کر رہے ہیں' کھڑکیاں اور کرسیاں توڑ رہے ہیں' ان میں جو توڑ پھوڑ کا جذبہ پیدا ہوا ہے' اسے قابل احترام تباہی کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔ اگر ہم نے اس انرجی کو صحیح سمت کی جانب نہ موڑا تو وہ بے معنی چیزوں کی تباہی پر ضائع ہو جائے گی۔ کرسیوں اور کھڑکیوں کی توڑ پھوڑ سے کچھ حاصل نہ ہوگا لیکن کرسیوں کی تور پھوڑ کی جرأت خوش آئند ہے۔ اس جرأت سے ہندو مسلم تشدد کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ برہمن' سدرا کی بیوقوفی روکی جا سکتی ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان قائم دیوانگی کی دیوار گرائی جا سکتی ہے۔ تباہ حال اخلاقیات کو عیاں اور ایک نئی' زیادہ صحت مند اقدار پیدا کی جا سکتی ہے۔

توڑ دینے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے...... لیکن استاد اس سے خوف زدہ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تباہ کر دینے کی یہ صلاحیت بُری ہے۔ فرنیچر توڑے جا رہے ہیں' کھڑکیاں توڑی جا رہی ہیں...... لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ بچوں کو یہ نہیں معلوم کہ کیا توڑنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کرسیاں توڑ رہے ہیں۔ اگر ٹیچر انہیں بتائیں کہ کیا چیز توڑنے والی ہے' تب وہ کرسیاں نہیں توڑیں گے بلکہ وہ چیزیں توڑنا شروع کر دیں گے جنہیں توڑنا چاہئے۔ لیکن ٹیچر خوف میں مبتلا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ''کوئی چیز نہ توڑو۔ نظم و ضبط پیدا کرو۔''

بہر حال تم نہیں جانتے کہ نظم و ضبط کو توڑنا ایک عظیم کام ہے۔ نظم و ضبط کی ایک قیمت ہے۔ نظم و ضبط کا نہ ہونا بھی ایک قیمت رکھتا ہے۔ نظم و ضبط کی قیمت یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کو جوں کا توں رکھے۔ لیکن جب سوسائٹی تبدیل ہو جائے تو نظم و ضبط بیکار ہے' اس وقت نظم و ضبط سے عاری (Indiscipline) ہونا قیمتی ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی کا وقت ہے۔

نظم و ضبط سے عاری بچوں سے استفادہ کرو۔ جو بری اور خراب چیزیں ہیں انہیں ختم کرنے کے لئے ان بچوں سے مدد لو۔ جو انسان کی زندگی پر چٹان جیسا بوجھ ہے' اسے تبدیل

ہو جانا چاہئے۔ یہ کام ٹیچر کر سکتا ہے کیونکہ وہی ان سے قریب تر اور گہرا تعلق رکھتا ہے۔ لیکن وہ بچوں کو سمجھنے سے قاصر ہے اور یہ نہیں جانتا کہ کیا ہو رہا ہے۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ بچوں میں باغیانہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر ٹیچر اس انقلابی جذبے کو سمجھ لے اور یہ کہ انقلاب کی جلتی ہوئی ٹارچ ان کے ہاتھوں میں ہے تو شاید بچے ٹیچر سے اس درجہ محبت کرنے لگیں کہ اس سے پہلے کبھی نہیں کی ہوگی۔ اس طرح ٹیچر بچوں کا مستقبل سنہری بنانے میں معاون ہوں گے کہ اس سے پہلے نہیں ہوئے ہوں گے۔

میں نے ٹیچر دوستوں کی خدمت میں چند سوالات پیش کئے ہیں۔ میری کہی ہوئی باتیں ضروری نہیں کہ صحیح ہوں بلکہ سب کی سب غلط ہو سکتی ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ تم اس پر یقین کر لو۔ لیکن برائے کرم اس پر غور ضرور کرو۔

اس سلسلے میں انتہائی ضروری ہے کہ پورے ملک میں مکالمہ کیا جائے۔ تا کہ ٹیچرز سوچنا شروع کریں۔ وہ بچوں سے گفتگو کریں اور انہیں سمجھائیں اور پھر کسی نتیجے پر پہنچیں۔ میں بہت پرامید ہوں، بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ صورت حال پوری طرح تیار ہے، بہتر موقع منتظر ہے، رائے عامہ ہموار ہے۔ یہ خدا ہے جس نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا ہے اور یہ ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے کہ ہم اسے استعمال اور اس عظیم قوت کا رخ موڑ دیں۔ یا تم پیچھے بیٹھے ہوئے دیکھتے رہو گے کہ کیا ہو رہا ہے اور بُری چیزوں کی مذمت کرنے کے سوا کچھ نہیں کرو گے؟ کیا تم صرف تماش بین بنے رہوں گے؟ کیا تم آنے والی سوسائٹی کی زندگی کے تماشائی بنے رہو گے؟ تم ہر دن جا کر اسکول میں جب پڑھا رہے ہو گے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں یا انہیں ABC پڑھا رہے ہو گے تو اس وقت سیاستداں ایٹم بم بنا رہے ہوں گے۔ جب تم ریاضی اور دنیا کا جغرافیہ پڑھا رہے ہو گے، عین اسی وقت سیاستداں دنیا کو تباہ کر دینے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔

نہیں، اب اسے مزید نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ضرور پڑھاؤ کہ دو اور دو مل کر چار ہوتے ہیں...... لیکن ایک استاد کا صرف یہی کام نہیں ہوتا۔ اسے انقلاب کا خالق بھی ہونا چاہئے۔ اسی وقت وہ استاد کہے جانے کا مستحق ہوگا۔ اسے زندگی کے ارد گرد ہونے والے واقعات سے آگاہ ہونا چاہئے۔ اسے بچوں کے ذہنوں میں پھوٹنے والی کونپل کا علم ہونا چاہئے۔ اسے زندگی میں اپنے کردار کی فکر ہونی چاہئے۔

ہندوستان میں بڑے اچھے ٹیچرز ہیں، لیکن وہ خواب غفلت میں ہیں۔ انڈیا میں بہت ذہین استادوں کی کھیپ ہے لیکن وہ انقلابی نہیں ہیں۔ انڈیا میں پرخلوص ٹیچرز موجود ہیں، ایسے استاد جو خوش کردار ہیں۔ لیکن ان کا خلوص اور خوش کرداری انحطاط پذیر اور تبدیلیوں کے خلاف ہے۔ وہ انقلابی نہیں ہے، یہی وجہ ہے جو وہ مجبور انداز میں بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ وہ خود کو تہی دست محسوس کرتا ہے۔ وہ صرف سوسائٹی کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔

سیاستدانوں نے پوری دنیا میں بشمول ہندوستان ٹیچرز کو زندگی کے دھارے سے الگ کر رکھا ہے۔ سیاستداں ٹیچرز سے کہتے ہیں کہ انہیں زندگی کے معیار اور سیاست کے متعلق فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں اسکول کی چہار دیواری کے اندر اپنا کام کرنا چاہئے۔ سیاستداں بہت چالاک ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر ٹیچرز نے زندگی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تو چونکہ اپنے ہاتھوں میں بہت بڑی قوت ہے اس لئے وہ پوری سوسائٹی کو تبدیل کر دے گا۔ چنانچہ اس نے عیاری اور مکاری سے ٹیچر کو مکمل طور پر زندگی سے الگ کر رکھا ہے۔

سیاستداں ٹیچرز کو احساس دلاتے ہیں کہ وہ زندگی کے متعلق فکر نہ کریں۔ ان کا کام بس یہ ہے کہ وہ بچوں کو پڑھائیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اور نقشے پر یہ دکھائیں کہ ٹمبکٹو کہاں واقع ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آیا ٹمبکٹو کا کہیں وجود ہے بھی یا نہیں۔ جب دن بہ دن انسانیت انحطاط پذیر ہو رہی ہو اور استاد خاموشی سے صورت حال کا جائزہ لے رہا ہو تو میں انہیں استاد کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

استاد کے ذمے ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ٹیچر نئی نسل کی مڈوائف ہے۔

سقراط نے استاد کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ نئی روح کی پیدائش میں استاد مڈوائف جیسا کردار ادا کرتا ہے۔ سقراط نے صحیح کہا ہے۔ وہ خود دنیا کا ایک عظیم اور بے مثال ٹیچر تھا۔ اس نے صحیح کہا ہے کہ ٹیچر کو مڈوائف کی طرح خدمات انجام دینا چاہئے اور نئی روح کی پیدائش میں مدد کرنی چاہئے۔ اگر ہم مڈوائف بننے کے لئے تیار نہیں ہیں تو ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ خود کو ٹیچر کہیں۔

میں نے یہاں چند پرخلوص مشورے دیئے ہیں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے پرسکون انداز میں خاموشی سے سنا۔ آخر میں، میں تمہارے اندر موجود الوہیت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ برائے کرم قبول کر لو۔

مکمل تعلیم

بنی نوع انسان کی بہت ساری بدنصیبیوں میں سے ایک وہ ہے جسے ہم خوش نصیبی کا درجہ دیتے ہیں۔ کیونکہ اسے اچھا اور بابرکت سمجھے بغیر اس بدنصیبی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے بچا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف ہم اس کی جڑوں میں پانی ڈالتے رہتے ہیں۔ ان سب کے نتیجے میں ہمارے سامنے جو آدمی آتا ہے اسی نے اس سوسائٹی کو جنم دیا ہے جو ہمارے اردگرد موجود ہے۔

تعلیم کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے میں ان بدنصیبیوں کو سب سے بڑی سمجھتا ہوں۔ یقیناً تم یہ سن کر حیران ہوئے ہو گے کیونکہ تعلیم کو اچھا ہی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کیا تم اس بات سے آگاہ ہو کہ تعلیم نے انسان میں نہ تو توازن پیدا کیا اور نہ صحت دی۔ اس کے برخلاف اس نے انسان کی زندگی سے توازن کو ختم کر دیا۔ لیکن یہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ ہم تعلیم کو اب تک جو سمجھتے رہے ہیں اس میں کچھ بنیادی غلطیاں ہیں۔

پہلی غلطی یہ ہے کہ ہم نے آدمی کو صرف خردمند سمجھ رکھا ہے۔ اس سے بڑی غلط بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ آدمی اکیلا خردمند نہیں' سوچنے سمجھنے کی قوت دی جانے والی تعلیم سے خردمندی آتی ہے۔ اس کے علاوہ آدمی نامکمل ہے۔ باقی آدمی غیر مہذب ہوتا ہے صرف سوچنے کی طاقت ہی مہذب ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے پورا جسم سکڑ کر ناکارہ ہو جائے' صرف اس کا سر بڑا ہوتا رہے۔ ایسا شخص صرف بدصورت ہوگا۔ ایسا آدمی چل پھر نہیں سکتا۔ اس کا زندہ رہنا مشکل ہوگا کیونکہ اس کا بڑا سر پورے جسم کا توازن برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ تعلیم کے نام بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ آدمی خردمند ہوتا ہے اور پھر گزشتہ تین ہزار سال تک انسان کی ذہانت کیلئے سب کچھ کرنے لگے۔ ذہانت تو بڑھی لیکن انسان کا پورا جسم پیچھے رہ گیا۔ آدمی کا بقیہ حصہ تین ہزار برس پیچھے رہ گیا جبکہ اس کی خردمندی تین ہزار سال آگے ہو گئی۔ کھنچاؤ اور ان دونوں کے درمیان کا فاصلہ ہمیں تباہ کر رہا ہے۔ اس نے ہمیں اپاہج بنا دیا ہے۔

آدمی کا پورا جسم تو اپنی جگہ ہے لیکن اس کی آنکھیں غائب ہیں۔ اس وقت ہم کہتے ہیں کہ اس کے جسم کا ایک حصہ مفلوج اور ناکارہ ہے۔ اگر ایک شخص کے جسم کا پورا حصہ تو ہو لیکن ٹانگیں نہ ہوں تو ہم اسے معذور کہیں گے۔ ایک مختلف قسم کی معذوری بھی ہوتی ہے جس کا ہمیں ادراک نہیں ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی صرف دو ٹانگیں ہوں اور کچھ نہ ہو تو وہ (Inverted Cripple) ہوگا۔

تعلیم نے آدمی کو صحت سے نہیں نوازا' اس نے اسے معذور بنا دیا' صرف اس کی ذہانت بڑھی ہے اور اس کے جسم کا باقی حصہ ترقی نہیں پا سکا۔ ذہانت تو بڑھی لیکن اس کا زندگی سے تعلق ختم ہو گیا۔

ہم کیا پڑھاتے ہیں؟ تعلیم کے نام پر ہم کیا دے رہے ہیں؟ کیا ہم زندہ رہنے کی کوئی تعلیم دے رہے ہیں؟ کیا ہم زندہ رہنے کا آرٹ پڑھا رہے ہیں؟ بالکل نہیں۔ ہم چند الفاظ پڑھاتے ہیں۔ ہم تھوڑی سی ریاضی پڑھاتے ہیں۔ چند زبانیں۔ کچھ کیمسٹری یا فزکس' کچھ تاریخ یا جغرافیہ۔ یہ سب کچھ پڑھا کر حقیقتاً کیا پڑھاتے ہیں؟ بس کچھ الفاظ۔

الفاظ زندگی نہیں ہوتے۔ الفاظ کے زندگی میں کچھ فائدے ضرور ہیں۔ لیکن صرف الفاظ کی تعلیم ہی زندگی کی تعلیم نہیں ہوتی۔ پھر ان الفاظ کے پڑھنے سے ہوتا کیا ہے' الفاظ کا ایک ڈھیر...... ایک پڑھے لکھے شخص کے پاس الفاظ کے علاوہ کوئی دوسری دولت نہیں۔ وہ ویسا ہی بے عقل ہوتا ہے جیسا کہ ایک بے پڑھا لکھا شخص۔ ان میں صرف ایک فرق ہوتا ہے' وہ زندگی کے تمام پہلوؤں سے اسی طرح بیگانہ رہتا ہے جیسا کہ جنگل میں رہنے والا کوئی قبیلہ بے گانہ رہتا ہے۔ وہ زندگی کے آرٹ کی سمجھ رکھتا ہی نہیں۔ وہ اس راستے کو جانتا ہی نہیں جس پر زندگی میں چلنا چاہئے۔ وہ زندگی کو سرے سے جانتا ہی نہیں۔ لائبریری کی کتابیں زندگی کے ساتھ کیا کر سکتی ہیں؟ ایسا شخص جو کلاس روم سے مانوس ہوتا ہے وہ زندگی سے نامانوس ہوتا ہے اور اس پر سوال کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ یہ بات ذہن نشین کی جانی چاہئے کہ یونیورسٹیز سے گولڈ میڈل لینے والوں کو زندگی بس مٹی کا میڈل ہی دیتی ہے۔

الفاظ کی تعلیم' صرف الفاظ کو جمع کرنا ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کی دولت ہوتی ہے۔ ذہن پر اس کا بوجھ ہوتا ہے' اس کی وجہ سے ذہن آزاد نہیں ہو پاتا' نہ زندہ رہتا ہے' نہ ہی غور و فکر کے قابل۔ وہ

زندگی کو اس کی اصل صورت میں دیکھنے کی سکت نہیں رکھتا۔ وہ زندہ رہنے کا آرٹ سکھاتا ہے اور نہ زندہ رہنے کے طریقے۔ آج تک ہم اسی کو تعلیم کہتے رہے ہیں۔ اس تعلیم کے نتیجے میں ہم آج بیمار، کم عقل اور امراض کے اسیر لوگوں کو دیکھ رہے ہیں۔

کیا تم جانتے ہو، آدمی کی تعلیم جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے وہ گمراہ (Perverted) ہوتا جاتا ہے؟ جبکہ ایک بے پڑھا لکھا شخص متوازن اور صحت مند ہوتا ہے۔ جنگل میں بسنے والوں کی اپنی ہی خوب صورتی ہوتی ہے، ایک خاص قسم کی موسیقی کی حامل، جس میں تمانیت ہوا کرتی ہے۔ ان کی زندگیوں کا کوئی مقصد اور مطلب ہوا کرتا ہے جو پڑھے لکھے لوگوں میں نہیں ہوا کرتا۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے۔ کیا ہم اپنی خوشیوں کے عوض تعلیم نہیں حاصل کرتے؟ کیا ہم خوشیوں کی کمی کا تجربہ نہیں کر رہے ہیں؟ کیا ہم زندگی کی جڑوں سے اپنا رابطہ منقطع کر رہے ہیں؟ اگر ہم غیر جانبدارانہ نظروں سے پڑھے لکھے لوگوں کو دیکھیں...... جو کہ انتہائی مشکل ہے کیونکہ ہم خود بھی پڑھے لکھے ہیں، چنانچہ یہ مشکل تر ہے کہ ہم میں پڑھے لکھے آدمی کی بیماریوں کو دیکھنے کی کی اہلیت پیدا ہوسکے۔ جہاں اسی طرح کی بیماریاں پھیلی ہوں، اس کا احساس کرنا انتہائی دشوار ہے۔

ہم سارے لوگ پڑھے لکھے ہیں، بلکہ پڑھاتے ہیں۔ ہم وہ لوگ ہیں جو اسی طرح کی تعلیم دے اور پھیلا رہے ہیں...... اس کو دیکھنا ہمارے لئے انتہائی دشوار ہوگا...... بہت دشوار کہ ہم جو کچھ پھیلا رہے ہیں، وہ آدمی کو صحت مند نہیں کرتا۔ لیکن وہ جو دیدۂ بینا رکھتے ہیں اور وہ جنہوں نے تعلیم کے دوران اپنی ذہانت کو ضائع نہیں ہونے دیا...... وہ اس کی بات کی اہلیت رکھتے ہیں کہ کچھ چیزوں کو دیکھ سکیں۔

امریکہ میں پڑھے لکھے لوگوں کی بہت بڑی تعداد ہے لیکن امریکہ میں ہی پاگلوں کی بہت بڑی تعداد بھی پائی جاتی ہے۔ کیا ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق ہے یا پھر یہ محض ایک اتفاق ہے؟ وہ ممالک جن میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، وہیں کے لوگوں کو اسی تناسب سے ذہنی کھنچاؤ بھی موجود ہے۔ کیا ہم ان اعداد وشمار سے واقف ہیں یا نہیں؟ جہاں جتنی زیادہ تعلیم ہے وہاں اتنی ہی خودکشیاں ہوتی ہیں۔ امریکہ میں ہر روز پندرہ (15) سے تیس (30) لاکھ لوگ

دماغی بیماریوں کا علاج کراتے ہیں۔ یہ حکومتی اعداد وشمار ہیں اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ حکومتی اعداد وشمار صحیح نہیں ہوتے۔ اگر 15 سے 30 لاکھ افراد روزانہ دماغی علاج کراتے ہیں تو اس کا سبب انفرادی مشکلات نہیں ہوسکتیں بلکہ یہ اجتماعی بیماری ہے جو آدمی کے دماغ میں داخل ہو رہی ہے۔

نیویارک میں تیس 30 فیصد لوگ بغیر نیند کی دوا کھائے نہیں سو سکتے۔ جبکہ سائنسی انداز سے تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ پچاس سال بعد کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو بغیر نیند کی گولی کھائے سوتا ہو۔ کیا یہ آگے بڑھتے ہوئے آدمی کی علامات ہیں؟ اور نیویارک کا کیا ذکر...... یہ بمبئی بھی جلد ہی کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔ اس ترقی میں ہم بھی کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہیں۔ ہندوستان اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔ ہندوستان جو ہر شعبے میں دنیا کا استاد ہے، وہ پاگل پن میں بھی استاد ہو جائے گا۔ ہم اس سے بچ نہیں سکتے۔ ہم تو اس سمت میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں۔ ہمارے راہنما کوشش کرتے جا رہے ہیں کہ ہم پیچھے نہ رہ جائیں۔

ذہنی کھنچاؤ اور بے آرامی کا تاریک سایہ، جو مغرب پر چھایا ہوا ہے...... اس کی وجوہات کیا ہیں؟ وہ لوگ جو تین سو برسوں سے مغرب کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، وہ اچھے لوگ ہیں اور ان کے ارادے بھی نیک ہیں، ان کے پیچھے انہی کا ہاتھ ہے۔ لیکن شاید وہ زندگی کی فطرت سے ناواقف ہیں۔ وہ شاید یہ سمجھتے تھے کہ صرف ذہانت کے بڑھنے سے لوگوں کو خوشیاں میسر آئیں گی۔ یقیناً ذہانت بڑھنی چاہئے، سوچنے سمجھنے کی طاقت میں اضافہ ہونا چاہئے لیکن زندگی کے تمام اعضاء میں تناسب کا ہونا ضروری ہے۔ پوری صحت میں اضافہ ہونا چاہئے، دل بھی صحت مند ہو، پوری شخصیت کو صحت ملے۔ اگر کوئی ایک عضو بڑھتا ہے تو خطرات یقینی ہیں۔

ذہانت میں دل نہیں ہوتا۔ وہ زندگی جسے دنیا ذہانت کے ذریعے تعمیر کر رہی ہے، وہ بھی بے دل ہوگی۔ ذہانت ریاضی ہے، محبت نہیں۔ ذہانت حساب کتاب اور اعداد وشمار ہے، احساسات نہیں۔ ذہانت اعداد اور منطق کے ذریعے سوچتی ہے جبکہ زندگی منطق اور اعداد اور ریاضی کے بغیر بڑھتی ہے۔

زندگی بڑی پراسرار چیز ہوتی ہے۔ کسی ریاضی میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس کی توضیح کر سکے۔ اعداد وشماریات میں یہ اہلیت نہیں کہ زندگی کی صورت حال سے نمٹ سکے۔ لیکن ذہانت کسی اسرار کی موجودگی کو تسلیم نہیں کرتی۔ ذہانت سمجھتی ہے کہ ہر چیز سادہ اور آسان ہے جیسے دو اور دو چار ہوتا ہے۔ یہی عدم اسرار ہے' ذہانت کی زندگی کے بارے میں بے قلب سمجھ' جس نے زندگی کو مشین جیسی چیز سمجھ رکھا ہے۔ دن بدن آدمی مشین جیسا بنتا جارہا ہے۔ ادھر ہم ایسے لوگوں کو جو مشین جیسے بنتے جارہے ہیں' لائق اور ہنرمند کہتے ہیں۔

مشین' انسان کے مقابلے میں زیادہ لائق ہوتی ہے اور اگر ہم اسی طرح آدمی کی لیاقت پر زور دیتے رہے تو آدمی ایک دن مشین جیسا لائق تو ہوجائے گا لیکن اپنی روح کے عوض۔ آدمی غلطیاں کرتا ہے' مشین نہیں کرتی' ہماری کوشش ہے کہ آدمی غلطیاں نہ کیا کرے' ہر طرح لیاقت کا مظاہرہ کرے جیسے ریاضی سے کوئی لغزش نہیں ہوتی۔

آدمی کا ریاضی کی طرح بغیر لغزش چلنا ایسا ہی ہے جیسے ریل گاڑی اپنی پٹریوں پر دوڑتی رہتی ہے۔ لیکن زندگی کا دریا کسی لائن پر نہیں بہتا۔ وہ انجان انداز میں غیر مانوس راستوں پر بہتا رہتا ہے۔ زندگی کا دریا آزاد ہوتا ہے جو کسی متعین ذہانت کا ڈھانچہ نہیں رکھتا...... لیکن ہم آج تک کیا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

چنانچہ میں پہلی چیز جو آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تعلیم میں صرف عقلمندی اور ذہانت نہیں ہونی چاہئے۔ زندگی کی دوسری جہتیں بھی ہیں اور وہ ذہانت سے زیادہ اہم ہیں کیونکہ آدمی ذہانت کے ذریعے زندگی نہیں گزارتا۔ انسان کی زندگی کے ذرائع' ان کی گہرائی ذہانت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہم نہ تو ذہانت کے سہارے محبت کرتے ہیں اور نہ ذہانت کے ذریعے غصہ کرتے ہیں۔ اسی طرح کسی سے نفرت بھی ذہانت کے ذریعے نہیں کرتے۔ خوب صورتی یا حسن کو ذہانت کے ذریعے نہیں پہچانتے۔ ذہانت کے ذریعے نہ تو کوئی نغمہ گاتے ہیں اور نہ کسی نظم کو پڑھتے ہیں۔ کوئی قابل ذکر تجربہ بھی ذہانت کے ذریعے نہیں کرتے۔ اگر صرف ذہانت کی تعلیم' زندگی کے تجربات کا راستہ روک دیتی ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ لیکن ہم ذہانت کی تعلیم دیتے چلے جارہے ہیں۔

اس تعلیم نے آدمی کو غیر متوازن بنا دیا ہے۔ یہی غیر متوازن شخص سب کچھ کئے جارہا

ہے۔ اس کے ذریعے کوئی بھی واقعہ ہوسکتا ہے' کوئی مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے اور ان مسائل کا پیدا ہونا یقینی ہے کیونکہ جب ایک آدمی اندر سے غیر متوازن ہوجائے تو اس کا ہر کام غیر متوازن ہوگا۔ ایسی صورت میں نہ کوئی حرکت ہوگی' نہ واضح گول' نہ موسیقی' نہ زندگی میں کوئی نغمگی ہوگی۔ یہ ہماری اول درجے کی بدنصیبی ہوگی...... کیونکہ ہم تعلیم کو محض ذہانت سمجھتے ہیں...... مکمل زندگی نہیں سمجھتے۔ زندگی کی تعلیم کے کچھ اور معنی ہوتے ہیں۔

میرے خیال سے ذہانت پر بہت زیادہ انحصار' آدمی کی بہت سی چیزوں کو روک دیتا ہے۔ ہم پانچ سال کے بچے کو اسکول بھیجنا شروع کردیتے ہیں۔ انہیں ذہانت کافی بار کے ساتھ آتی ہے' وہ بار ان کے جسم پر پڑتا ہے' ان کے دلوں پر' ان کی محسوسات پر۔ ان کی زندگی کی صلاحیتیں جو خوشیوں اور لطف کا سبب بنتی ہیں' وہ تباہ ہوجایا کرتی ہیں۔ زندگی کا سارا لطف وسرور' ذہانت کے ہاتھوں غارت ہوجاتا ہے اور زندگی سوکھ کر رہ جاتی ہے۔

یہ بچے بے دلی سے پروان چڑھتے ہیں جن کی کوئی محسوسات نہیں ہوتیں۔ ان میں محبت کا فقدان ہوتا ہے' وہ مشین جیسے ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ان کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے عہدے تک پہنچ جائیں' وہ زیادہ سے زیادہ تنخواہ گھر لائیں۔ ان کے کام کی صلاحیت اچھی سے اچھی ہو۔ کیا آدمی اسی لئے پیدا ہوا ہے؟ کیا آدمی اس لئے پیدا ہوا ہے کہ وہ کچھ مزید خوشیوں کی دولت تلاش کرے؟ اور اس دولت کی تلاش کے لئے یہ ضروری ہے کہ چند دیگر چیزوں کو بڑھایا جائے۔

میرا خیال ہے...... یہ بات تمہارے لئے اچنبے کا باعث ہوگی اگر میں آج یہ کہوں...... جب تک بنی نوع انسان یہ فیصلہ نہ کرے' خواہ آج یا کل کہ بارہ یا چودہ برس کی عمر تک ان پر ذہانت کا بار نہ ڈالا جائے۔ بچوں پر اس ذہانت کا بار چودہ سال کی عمر کے بعد ڈالنا چاہئے۔ چودہ برس کی عمر تک بچوں کی جسمانی نشوونما اور احساسات کو پختہ کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔

بچوں کی زندگی کے پہلے چودہ سال' نشوونما کے لئے نہایت اہم ہوتے ہیں۔ بچہ جب بلوغت حاصل کرتا ہے تو وہی وقت ذہانت بڑھانے کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ اس سے قبل زندگی کے دوسرے حصوں کی نشوونما ہونی چاہئے۔ بچے کی صحت اچھی اور ترقی پذیر ہونی چاہئے'

بچے کی محسوسات کو پروان چڑھنا چاہئے۔ بچے میں محبت کا جذبہ اجاگر ہونا چاہئے کیونکہ بچے میں اگر شروع سے ہی محبت کی صلاحیت نہ پیدا کی جائے تو بڑھاپے تک اس میں محبت کے جذبات کا فقدان رہتا ہے بلکہ بڑھاپے میں بھی محبت کے جذبات نہیں پیدا ہوتے۔

بچپن میں محبت کے جذبات پیدا کرنے کے خوش گوار اور حیرت انگیز مواقع ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ان مواقع کو ریاضی' جغرافیہ اور تاریخ پڑھا کر ضائع کر دیتے ہیں۔ ان سب چیزوں کا آخر مقصد کیا ہوتا ہے؟ اگر بچہ جغرافیہ نہیں جانتا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور اگر بچہ ان دیوانوں کے نام سے ناواقف ہے جیسے اکبر' نپولین اور سکندر تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر بچہ ان اعداد و شمار کو نہیں جانتا کہ کس نے کتنے لوگوں کو قتل کر دیا تو کیا ہوگا اور انہیں یہ پڑھانا کہ فلاں شہنشاہ کب پیدا ہوا اور کب مرا؟ اس کے نہ کوئی معنی ہیں اور نہ مطلب۔ لیکن وہ لمحات جس میں اس کے محبت کے جذبات کی آبیاری کی جانی چاہئے ان بے وقوفیوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔

اور کیا تم جانتے ہو کہ بچپن کے بعد پیدا ہونے والی محبت جھوٹی' کھوکھلی اور پُر فریب ہوتی ہے؟ بچپن کی محبت اور بلوغت کے بعد کی محبت میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ بچپن کی محبت کا تقدس' اگر ضائع ہو جائے...... اگر وہ معصومیت ضائع ہو جائے...... تو اسے زندگی میں دوبارہ حاصل کرنا دشوار اور ناممکن ہو جاتا ہے۔

بچپن میں محبت کی پوری پوری صلاحیت کو پیدا کرنا چاہئے' ذہانت وغیرہ کو بڑھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے کیونکہ زندگی کا عالیشان محل محبت کی بنیادوں پر استوار ہے۔ صرف اسی سے کامل مسرت پائی جاسکتی ہے۔ خوشی اور مسرت کا ذہانت سے کوئی رشتہ نہیں۔ لیکن ہم ابتداء میں ہی ذہانت کو درمیان میں لے آتے ہیں۔ اس طرح جو بھی تعمیر ہوتی ہے وہ معبد نہیں بلکہ فیکٹری ہوتی ہے۔ اگر آدمی کی زندگی فیکٹری میں بنی ہوتی تو عمارت کی بنیاد ذہانت ہوتی۔ اگر آدمی کی زندگی معبد میں بنتی ہے تو اس کی بنیاد کو محبت پر استوار ہونا چاہئے۔

بچپن کا پورا عرصہ قلب کو فزوں تر کیا جانا چاہئے۔ تمام کوششیں دل کو آراستہ کرنے کے لئے ہونی چاہئے۔ دل کی تعمیر و ترقی مختلف انداز میں کی جانی چاہئے' یہ مواقع اسی طرح نہ حاصل کئے جائیں جیسے اسکول اور کالجز میں ہوتے ہیں۔ دل کے نکھار کے لئے ضروری ہے کہ بچے

کھلے آسمان تلے ہوں۔ درختوں کے نیچے' چاند ستاروں کی چھاؤں میں' دریا کے کنارے اور ساحل سمندر پر' جس کا مٹی اور زمین سے رابطہ ہو۔ بچہ جتنا وسعت سے قریب ہوگا' اس میں اتنی ہی محبت پیدا ہوگی اور اس کے احساس اور خوب صورتی کے شعور میں اضافہ ہوگا۔

چھوٹے بچوں کے ساتھ' جو دیوار کے قریب بلیک بورڈ کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں ایک جرم کا ارتکاب کیا جاتا ہے...... اس طرح کے گناہ کے لئے' آج نہیں تو کل بنی نوع انسان اس کا حساب لے گی اور ہم قصوروار ٹھہرائے جائیں گے۔

اس سے پہلے کہ وہ شعور کی عمر کو پہنچیں' ہم انہیں تعلیم کے نام پر بند کمروں میں قید کر دیتے ہیں اور وہاں انہیں پڑھاتے کیا ہیں؟ ہم انہیں زندگی کی کونسی تعلیم دیتے ہیں؟ تب بچپن کے عجیب و غریب لمحات جس میں زندگی سے رابطہ پیدا ہونا ہوتا ہے ضائع ہو جاتے ہیں۔

رابندر ناتھ نے کہا ہے" میں اسکول میں قید تھا' باہر پرندے نغمہ سرا تھے اور میں بلیک بورڈ کو دیکھ رہا تھا۔ پرندوں کی آوازیں خوب صورت اور حیرت انگیز تھیں لیکن میں ٹیچر کی بے کیف آوازیں سن رہا تھا جو ہمیں جغرافیہ پڑھا رہا تھا۔ جب میرے کان اور میرے حواس باہر پرندوں تک پہنچتے تھے تو مجھے سزا دی جاتی تھی۔"

رابندر ناتھ ٹیگور نے کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ وہ خوش قسمت تھا ورنہ دنیا آج ایک عظیم شاعر سے محروم ہوتی۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ اس کے والدین نے اسے اسکول سے اٹھالیا۔ اگر اس کے والدین اسے تعلیم دلانے میں کامیاب ہو جاتے تو دنیا کو بڑا نقصان اٹھانا پڑتا اور تاریخ میں دنیا کو کتنے نقصانات ہو چکے ہیں اس کا حساب کتاب کرنا مشکل ہے' کیونکہ ایسا کوئی طریقہ نہیں کہ یہ دیکھا جائے کہ کتنے رابندر ناتھ ٹیگور اسکول جا کر تباہ ہو چکے ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے جب پہلی بار اسکول کھولا تو کون تھا جو اس میں اپنے بچوں کو تباہ کرنے کے لئے بھیجتا؟ اگر میں اپنا اسکول کھولوں تو کیا تم اپنے بچوں کو وہاں بھیجو گے؟ نہیں' تم نہیں بھیجو گے۔ اپنے بچے کو کوئی خراب ہونے کے لئے نہیں بھیجتا؟ لیکن رابندر ناتھ ٹیگور کے چند ایسے دوست تھے جنہیں وہ مزید خراب نہیں کرنا چاہتے تھے...... انہوں نے اپنے بچوں کو رابندر ناتھ کے اسکول بھیج دیا۔ وہ اتنے خراب ہو چکے تھے کہ مزید خراب ہونے کی کوئی امید نہیں

تھی۔ رامانند چٹرجی‘ Modern Review کے ایڈیٹر نے اپنے بیٹے کو اس اسکول میں بھیجا۔ وہ اس سے تنگ آ چکا تھا۔

کوئی ایسا بچہ جس میں تھوڑی بہت ذہانت ہو تو اس کے والدین اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ والدین ذہانت سے عاری‘ بدھو بچوں کو جس میں غیر معمولی ذہنی صلاحیت نہ ہو‘ پسند کرتے اور چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان سے جب اور جہاں بیٹھنے کو کہا جائے تو وہ بیٹھ جاتے ہیں اور جہاں کھڑا کیا جائے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کی نہ اپنی کوئی روح ہوتی ہے اور نہ اپنی کوئی ہستی۔

چنانچہ رامانند نے بھی اپنے بچے کو وہیں بھیج دیا۔ تین ماہ بعد رامانند وہاں گیا کہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرے‘ اسکول کیسا چل رہا ہے۔ اسے امید نہیں تھی کہ اسکول چل رہا ہوگا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ رابندر ناتھ ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ دس پندرہ بچے اس کے ارد گرد موجود تھے اور پڑھائی ہو رہی تھی۔ رامانند قریب آیا تو معلوم ہوا کہ دس پندرہ بچے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے جبکہ اتنے ہی بچے درختوں کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ کس قسم کی کلاس تھی؟

اس نے رابندر ناتھ سے پوچھا۔ ’’مجھے پہلے ہی شبہ تھا‘ کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہ کلاس ہے؟ یہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا...... بچے درخت کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں۔‘‘

رابندر ناتھ نے جواب دیا۔ ’’مجھے بھی افسوس ہے۔ پھل پک چکے ہیں۔ مجھے ان بچوں پر افسوس ہے جو درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے بھی افسوس ہے۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں ورنہ میں بھی درخت پر سب سے اوپر موجود ہوتا۔ پھل پک چکے ہیں۔ ہوائیں پھلوں کی خوشبو بکھیر رہی ہیں۔ درخت پکار کے بلا رہے ہیں‘ اگر بچے ان پر نہیں چڑھیں گے تو پھر کون چڑھے گا؟ درخت نے دعوت دی ہے...... وہ بچے جو نیچے بیٹھے ہوئے ہیں وہ بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ درخت کی دعوت ان تک نہیں پہنچی ہے۔ درخت کا پیغام ان کے نتھنوں تک نہیں پہنچا ہے کہ پھل پک چکے ہیں۔ درخت پکار رہے ہیں کہ آؤ۔ وہ تمام لوگ جو بوڑھے ہو چکے ہیں اور درخت پر نہیں چڑھ سکتے‘ انہیں افسوس ہے۔ لیکن یہ بچے ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ میں یہاں بیٹھا ہوا یہی سوچ رہا ہوں۔ کیا یہ بچے بوڑھے ہو چکے ہیں؟ کیا انہوں نے درخت کے پیغام کو محسوس

نہیں کیا؟ کیا ان تک پیغام نہیں پہنچا؟‘‘

ہم اپنے بچوں کو بچپن میں ہی بوڑھا بنا دیتے ہیں اور اگر نوجوانی میں ان کی زندگی سے تازگی ختم ہو جائے تو اس کا ذمہ دار کون ہوا؟ جیسا کہ میں دیکھتا ہوں‘ ان کے ساتھ بُرا رویہ رکھا جاتا ہے‘ ان کے ساتھ جبر کیا جاتا ہے‘ بہت سی غلط باتیں ہوتی ہیں۔ بچپن بہت حیرت انگیز ہوتا ہے جو زندگی میں دوبارہ نہیں آیا کرتا۔ ریاضی اور حساب کتاب کے معاملات بعد میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ پوری زندگی پڑی ہے...... لیکن زندگی کے چند انتہائی قیمتی معاملات صرف بچپن میں ہوتے ہیں جو بعد میں نہیں ہو سکتے۔ وہ بچے جو مناظر قدرت سے قریب نہیں ہوتے‘ وہ خدا سے بھی قربت کے اہل نہیں ہوتے ہمیں یہ بات سمجھنی چاہئے...... کیونکہ نیچر ہی خدا تک پہنچنے کا دروازہ ہے۔ جس نے بچپن میں اس کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا کہ خدا موجود ہے...... آسمان کے نیچے‘ سورج میں‘ سمندر کے پاس پڑی ہوئی ریت پر‘ درختوں کے قریب...... وہ بڑھاپے تک عبادت گاہوں میں عبادت کرتا رہے گا‘ بتوں کے سامنے جھکتا رہے گا‘ گیتا اور بائبل پڑھے گا‘ اسے یاد کرے گا لیکن کسی بھی طرح اس کا تعلق خدا سے نہیں ہو پائے گا۔ کیونکہ اس نے داخلے کا دروازہ تو پہلے ہی بند کر دیا ہے۔ راستے کو تو اس نے چھوڑ دیا ہے۔

سب سے پہلی اور ضروری چیز جاننے کی یہ ہے کہ ہم بچوں کو نیچر کی قربت فراہم کریں‘ آدمیوں کے بنائے ہوئے گھروں کے قریب نہ لے جائیں بلکہ زندگی کی انرجی نے جو کچھ پیدا کیا ہے‘ اس کے قریب کریں‘ کیونکہ یہی چیزیں ہیں جو اسے خدا کے قریب کریں گی۔ یہی چیزیں ہیں جو ان کے دلوں میں محبت کے چراغ روشن کریں گی۔ یہی وہ چیزیں ہیں جس کے تحت وہ عبادت کے رموز سمجھیں گے اور پھر ان کی زندگیاں نکھر کر باہر آئیں گی...... ان میں محبت پہلے پیدا ہونی چاہئے‘ اس کے بعد ریاضی وغیرہ۔ کیونکہ جس میں محبت کے جذبات ہوں‘ اس شخص کو کوئی ریاضی گمراہ نہیں کر سکے گی۔

کسی نے سینٹ آگسٹائن سے پوچھا۔ ’’ہمیں کیا کرنا چاہئے کہ ہم سے کوئی بُرائی سرزد نہ ہو؟‘‘

سینٹ آگسٹائن نے جواب دیا۔ ’’مجھ سے یہ نہ پوچھو‘ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ اگر تم محبت سے آگاہ ہو تو پھر تم جو کچھ بھی کرو گے وہ بُرائی نہیں ہوگی۔‘‘

آگسٹائن نے کہا کہ اس بارے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کہ بُرائی سے کس طرح بچا جائے۔ سوال یہ نہیں ہے اگر تم میں محبت کے جذبات نہیں ہوں گے تو تم جو کچھ بھی کرو گے وہ بُرائی ہوگی اور اگر تمہارے اندر محبت موجود ہوگی تو تم جو کچھ بھی کرو گے وہ بُرائی نہیں ہوگی۔

لیکن محبت اور محبت اپنانے کی تعلیم کہاں دی جاتی ہے؟ ہمارے پاس محبت کا کون سا سرٹیفکیٹ ہے؟ پھر اگر تین ہزار برسوں میں آدمی خلوص و محبت سے عاری، قاتل اور تشدد پسند ہو چکا ہے تو یہ کس کی ذمہ داری ہے؟

ہماری تعلیم کے علاوہ دوسرا شخص اس بات کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن ٹیچر کو اس بات سے ناراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ ذمہ داری تعلیم پر رکھ کر میں تعلیم کو بے انتہا احترام پیش کر رہا ہوں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ زندگی کا مرکز تعلیم ہے۔ چنانچہ ٹیچر کو اس کی ذمہ داری قبول کرنا چاہئے۔ کل اس کے حصے میں بنیادی احترام بھی آ سکتا ہے۔ کل اگر زندگی میں تبدیلی آئی تو یہ تعلیم ہی ہوگی جس کے سر احترام کا سہرا ہوگا اور آج اگر زندگی میں غلاظت اور زہر بھرا ہے تو پھر تعلیم سے متعلق لوگوں کو اسے قبول کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اس ذمہ داری کو بھی۔ یہ تعلیم کو مرکزی حیثیت دینے کا اشارہ ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں بھرپور احترام ہے کہ تعلیم ہی مرکز ہے۔ سیاستداں اور مذہبی راہنما اتنے ذمہ دار نہیں جتنے ٹیچرز ہیں۔

لیکن آنے والی دنیا ٹیچر کو یقیناً احترام دے گی اگر وہ زندگی کو تبدیل کرنے کی بنیادیں فراہم کریں گے۔ اگر تم نے اس کی تبدیلی میں اپنی اہلیت نہ دکھائی تو کل بچے اسے تبدیل کرنا شروع کر دیں گے۔

میرا ایک دوست ابھی جلد ہی ہالینڈ اور بلجیم کے دورے سے واپس آیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہائی اسکول کے لڑکے اور لڑکیوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے سے انکار کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہاں نوجوانوں کے بڑے سینٹرز اور بڑی یونیورسٹیز ہیں اور وہ کیا کہتے ہیں۔ مزید تعلیم حاصل کرنے سے کیا ملے گا؟ انہوں نے اپنے والدین سے کہا۔ ''تم لوگ بہت پڑھے لکھے ہو لیکن زندگی میں کیا حاصل کیا؟ پھر ہم پر اسی مشین سے کیوں دباؤ ڈالتے ہو، جس کو پاس کرنے کے بعد تم بھی کچھ حاصل نہیں کر سکے؟'' اور والدین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

اگر تمہارے بچوں نے تم سے پوچھا کہ تعلیم کے بعد تم نے کیا حاصل کیا، تو تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟ کیا تم انہیں اپنی تجوری کھولکر دکھاؤ گے؟ کیا انہیں اپنے بڑے گھروں کو دکھاؤ گے؟ کیا تم انہیں اس کرسی کو دکھاؤ گے جسے تم نے دہلی میں حاصل کی ہے؟ تم بچوں کو کیا دکھاؤ گے؟ کیا تمہارے پاس کوئی ایسی چیز ہے جسے تم نے تعلیم کے بعد حاصل کی ہے؟ تم بچوں کو کیا دکھاؤ گے؟ کیا تمہارے پاس کوئی ایسی چیز ہے جسے تم نے تعلیم کے بعد حاصل کی ہے؟ کیا تم بڑے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو۔ ''میری خود اعتمادی عظیم ہے؟'' کیا تم بڑے اعتماد سے کہہ سکتے ہو۔ ''زندگی کے متعلق میرا تشکر بڑھ چکا ہے؟'' کیا تم کہہ سکتے ہو۔ ''میں مقدس اور متبرک ہو چکا ہوں؟'' تم یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتے۔

چنانچہ بچے تم سے سوال کرنے والے ہیں، آج نہیں تو کل...... اور تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ بچے تمہاری تعلیمی فیکٹریوں میں جانے سے انکار کرنے والے ہیں۔ زیادہ پڑھے لکھے ممالک میں تو انہوں نے پہلے ہی انکار کرنا شروع کر دیا ہے اور ان کا انکار درست ہے۔ لیکن کیا ان کے انکار سے پہلے ہم زندگی سے متعلق پورے تصورات کو تبدیل نہیں کر سکتے؟

بلوغت کی عمر تک، جب تک کہ بچے جنسی بلوغت تک نہ پہنچ جائیں...... چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی...... اس وقت تک ان کی مرکزی تعلیم محبت اور قلب ہونی چاہئے کیونکہ باقی زندگی اسی سے متعلق ہوگی۔ بچہ شوہر بنے گا یا بیوی، بچہ یا تو باپ بنے گا یا ماں...... ان کے تمام جذباتی رشتے، محبت اور دل کے رشتے ہوں گے۔ ریاضی، جغرافیہ یا تاریخ نہیں ہوں گے۔

کوئی عورت اس لئے اچھی ماں نہیں بن سکتی کہ اس نے تاریخ پڑھ رکھی ہے، اسی طرح کوئی مرد اس لئے اچھا باپ نہیں بن سکتا کیونکہ اس نے جغرافیہ پڑھ رکھا ہے۔ کوئی اور چیز جو اچھی ماں اور اچھا باپ بناتی ہے۔ اچھی بیوی اور اچھا شوہر بننے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کل پوری دنیا میں نہ تو ماں ہے اور نہ باپ۔ اسی طرح نہ شوہر ہے نہ بیوی۔ یہ سب جعلی اور بناوٹی رشتوں کے نام ہیں۔ کیا تم نے کبھی اسے دیکھا ہے جسے تم اپنی بیوی کہتے ہو؟ ممکن ہے تم کسی اور سے محبت کرتے ہو جسے اپنی بیوی نہیں کہہ سکتے۔

ایک شخص جسے بیوی شوہر کہتی ہے...... کیا اس نے کبھی اس سے محبت کی، اس کا احترام کیا؟

کبھی اس نے اس سے دل سے محبت کی؟ اس کے لئے دعائیں کیں؟ کیا اس نے کبھی کوئی ایسا قدم اٹھایا جس سے اس کی زندگی میں خوشیاں آ گئی ہوں؟ بالکل نہیں۔ بلکہ اس کی بیوی نے جتنے کانٹے ممکن ہو سکتے تھے اس کی راہوں میں بکھیر دیئے یا پھر ممکن حد تک مسائل پیدا کئے ہیں اور شوہر بھی یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ والدین بھی یہی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بچوں سے محبت کرتے ہیں لیکن ہم تو محبت جانتے ہی نہیں پھر اپنے بچوں سے کیونکر کریں گے؟

اگر ہم اپنے بچوں سے محبت کر رہے ہوتے تو دنیا میں اتنی جنگیں کبھی نہ ہوتیں۔ وہ والدین کون ہیں جو اپنے بچوں کو جنگ لڑنے کے لئے بھیجتے ہیں؟ اگر ہم اپنے بچوں سے محبت کر رہے ہوتے تو دنیا اتنی گھناؤنی نہ ہوتی۔ اگر ہم اپنے بچوں سے محبت کر رہے ہوتے تو یہاں تک چلے جاتے کہ ہم بچہ پیدا ہی نہیں کریں گے۔ کیا اس گندی غلیظ دنیا میں بچے پیدا کریں گے؟ وہ خود سے یہ کہتے ہوئے معذرت کر لیں گے کہ "اس طرح کی دنیا میں بچے کیوں پیدا کریں؟ کل جب ان کا سامنا ہوگا تو شرم دامن گیر ہوگی کہ ہم نے انہیں اس جیسی دنیا میں پیدا کیا ہے۔ کیسے اس گھناؤنی دنیا میں بھیجیں جو بداخلاقیوں اور تاریکیوں سے سرتاسر بھری ہوئی ہے۔" والدین کے دل میں اگر محبت ہوتی تو وہ بچے پیدا کرنے سے انکار کر دیتے۔

لیکن نہیں۔ وہ بچے پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں بچوں کی قطعاً کوئی پروا نہیں۔ وہ بچے پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ بچوں کو بندوق اور توپ کی گولی کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ وہ بچوں کو مختلف طریقوں سے مذبح خانے بھیج رہے ہیں۔ کبھی ہندوستان کے نام پر، کبھی چین کے نام پر، کبھی کمیونزم کے نام پر، کبھی جمہوریت کے نام پر۔ والدین کسی نہ کسی نعرے پر بچوں کو قتل ہونے کے لئے بھیجتے رہتے ہیں۔ یہ نام اور نعرے ان کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں جبکہ بچوں کی کوئی حیثیت نہیں۔

اگر والدین کے دلوں میں اپنے بچوں سے محبت کے جذبات ہوں تو دنیا یکسر بدل جائے گی اور جنگیں نہ ہو سکیں گی...... کیونکہ ہر بچہ کسی نہ کسی ماں کا بیٹا ہوتا ہے اسی طرح کسی باپ کا بیٹا بھی۔ کون ہے جو اپنے بچوں کو جنگ پر بھیجے گا؟ ہم کہیں گے کہ پاکستان کو ختم کر دو یا انڈیا کو تباہ کر دو لیکن بچے جنگ پر نہیں جا سکتے۔ کیا چین بچا ہوا نہیں ہے، کیا روس قائم نہیں ہے، کیا امریکہ موجود ہے یا نہیں، کوئی ماں اپنے بچے کو جنگ پر بھیجنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جنگوں کو دنیا

سے ختم ہو جانا چاہئے۔ اسی طرح سیاست بھی۔ سیاستداں اور قومیں۔ لیکن اپنے بچوں سے تو کوئی بھی محبت نہیں کرتا بلکہ ہم محبت کو جانتے ہی نہیں۔ سادہ سی بات ہے کہ ہم محبت سے ناواقف ہیں۔ ہم محبت کے قریب تک نہیں پہنچے۔ وہ لمحات جس میں محبت سے ناتا جوڑنا چاہئے ہم بہت سی فضول چیزوں میں برباد کر دیتے ہیں۔

چنانچہ میرے نقطۂ نظر سے تعلیم کی بنیاد محبت ہونی چاہئے، ذہانت وغیرہ نہیں۔ ذہانت صرف ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر اس میں محبت کی آمیزش ہو تب وہی ذہانت محبت کو چمکانے پر صرف کی جائے گی اور اگر اس میں محبت نہ ہو تو ذہانت نفرت پھیلانے کا ذریعہ ہوگی۔

ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے کا حکم ٹرومین نے دیا۔ دوسری صبح ہم نے سنا کہ صحافیوں نے ٹرومین کو گھیر کے پوچھا۔ "کیا تم گزشتہ شب پر سکون نیند سو سکے؟"

ٹرومین نے جواب دیا۔ "بہت پرسکون۔ میں نے جب یہ سنا کہ ہیروشیما اور ناگاساکی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکے اور جاپان نے ہتھیار ڈال دیا تو میں پہلی بار پرسکون نیند سویا۔"

کسی صحافی نے یہ نہیں پوچھا کہ "ایک لاکھ بیس ہزار (120,000) افراد لقمہ اجل بن گئے اور تم پرسکون نیند سو گئے؟ کیا تم انسان ہو یا پھر کچھ اور؟" لیکن اس شخص کا نام ٹرومین ہے۔ ٹرومین یعنی اصلی آدمی۔

ہماری تعلیم بس ایسے ہی ٹرومین پیدا کر رہی ہے جس میں انسانیت ہوتی ہی نہیں۔ ان میں زندگی کی انرجی کا فقدان ہوتا ہے۔ ان میں دردمندی اور ترحم نہیں ہوتا، جس میں محبت کا آبشار نہیں گرتا اور جس میں محبت کا آبشار نہ ہو کمپیوٹر ہو سکتا ہے۔ ایک مشین ہو سکتا ہے جس سے حساب کتاب کیا جا سکے لیکن انسان نہیں ہو سکتا۔ انسان ہونے کی پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس میں محبت ہو، عظیم شخص وہی ہوتا ہے جس میں محبت کی فراوانی ہو۔ خدا سے قربت عظمت کی دلیل ہوتی ہے۔

چنانچہ میں صرف ایک بنیادی بات کہنا چاہتا ہوں۔ تعلیم کا پہلا زینہ محبت کا زینہ ہے اور محبت کے اس زینے پر قدم رکھنے کے لئے بند دیواروں کی نہیں کھلے آسمان کی ضرورت ہوتی ہے چڑیوں، درختوں، ستاروں اور چاند کی۔ بنیادی تعلیم میں جغرافیہ نہیں بلکہ حسن ہونا چاہئے خوبصورتی۔ بنیادی تعلیم میں سائنس نہیں آرٹ ہونا چاہئے، بنیادی تعلیم میں کھنچاؤ

(Tension) نہیں آسودگی اور سکون ہونا چاہئے۔

اگر ہم چودہ سال کی عمر تک ایسی تعلیم کا انتظام کر سکے تو پھر بچوں کو تباہی سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد انہیں کسی بھی اسکول یا یونیورسٹی میں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر انہیں کچھ بھی پڑھایا جا سکتا ہے اور کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اس وقت اگر ان کے ہاتھوں میں تلوار دے دی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ اگر ان کے حوالے ایٹم بم کر دیا جائے تو اس سے بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کسی بھی نقصان کا امکان نہیں۔ اس وقت بڑی سے بڑی طاقت بھی تعمیری ہو جائے گی۔

سائنس نے انسان کو بہت بڑی طاقت فراہم کی ہے لیکن تعلیم نے محبت کرنے والا دل نہیں پیدا کیا۔ جن میں محبت کا فقدان ہو ان کے ہاتھوں میں بڑی طاقت آ جانا انتہائی خطرناک ہے۔

نادر شاہ ہندوستان کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے ایک نجومی سے پوچھا۔ کیا زیادہ سونا بہت بُری عادت ہے؟ ''میں بہت زیادہ سوتا ہوں۔ کیا واقعی اتنا سونا بُرا ہے؟''

نجومی نے جواب دیا۔ ''نہیں۔ اگر تم جیسے لوگ دن میں چوبیس گھنٹے سوتے ہوں تو بہت اچھا ہے۔ اگر خراب لوگ ہمیشہ کے لئے سو جائیں تو بہتر ہے۔ اچھے لوگوں کی بیداری اچھی ہوتی ہے اور بُرے لوگوں کی نیند اچھی۔''

کہا جاتا ہے کہ نادر شاہ نے اس کا سر قلم کرا دیا۔ لیکن اس نے بات بالکل صحیح کہی تھی۔ سچ کہنے والوں کا سر قلم کر دینا پرانی روایت ہے۔ اس نے صحیح بات کہی تھی کہ یہ اچھا ہے اگر بُرا آدمی سوتا رہے اور اچھا آدمی جاگتا رہے تو یہ اچھا ہے۔

اسی طرح، میں کہتا ہوں کہ ایک محبت کرنے والا طاقتور ہو جائے تو اچھا ہے اور ایک ایسا آدمی جس میں محبت نہ ہو اور اس میں طاقت نہ آئے تو اچھا ہے۔ اگر طاقت محبت کرنے والے کے ہاتھ میں ہو تو زندگی پروان چڑھتی ہے اور اگر محبت سے عاری شخص کے ہاتھوں میں طاقت آ جائے تو زندگی ایک قبرستان بن جائے گی اور کچھ نہیں...... اور ہم یہی کچھ کر رہے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم ان باتوں پر غور و فکر کریں۔

میں یہاں ٹیچرز سے یہی درخواست کرنے اور زور دینے کے لئے آیا ہوں کہ وہ

سوچیں...... وہ غور کریں کہ دلوں میں محبت کے جذبات کیسے پیدا کئے جا سکتے ہیں اور اگر ضروری ہو جسے میں بھی سمجھتا ہوں...... سو برس کے لئے دنیا کے تمام اسکولوں اور کالجز اور یونیورسٹیاں بند کر دی جائیں اور آدمی کو مکمل طور پر تعلیم سے روک دیا جائے۔ اس طرح کسی نقصان کا کوئی امکان نہیں بہ نسبت اس نقصان کے جو موجودہ تعلیم سے اگلے سو برسوں میں ہونے والا ہے۔

ہزاروں سال تک آدمی نے تعلیم نہیں حاصل کی۔ ان بے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی معلوم تھا کہ خوشی اور طمانیت کیا ہوتی ہے۔ نغموں سے واقف تھے، محبت جانتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی دنیا بنا رکھی تھی، اپنی زندگیوں میں ایک دنیا اور یہ جانتے تھے کہ خوشی کیا ہوتی ہے اور مسکراہٹ کیا ہے...... ہم سے زیادہ۔ ہم سے بہت زیادہ۔ ہم نے وہ سب کچھ ضائع کر دیا۔

یہ ضروری ہے کہ آدمی کو فطرت یا قدرتی ماحول میں واپس لایا جائے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ تعلیم کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تعلیم کی بنیاد کو تبدیل کر دیا جائے اور اگر یہی تعلیم جاری رہتی ہے، اگر اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے، اگر صرف یہی تعلیم دی جا سکتی ہے تو پھر اس تمام تعلیمی نظام کو روک کر آدمی کو جنگل میں بھیج دینا چاہئے۔ اس طرح بھی ہم کچھ ضائع نہیں کریں گے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا کوئی متبادل موجود ہے۔ تعلیم مکمل ہو سکتی ہے۔ اگر اس میں صرف ایک چیز کا اضافہ کر دیا جائے۔ اگر اس کی بنیاد محبت ہو جائے، احساس اور قلب اور ترحم اور فطرت کو اجاگر کیا جائے۔ آدمی کے دل کو پہلے اور ذہانت کو بعد میں اہمیت دی جائے۔ اگر ذہانت کے ساتھ دل کی راہنمائی چلے، اسی وقت تعلیم صحیح تعلیم ہو سکتی ہے۔

میں ناامید نہیں ہوا۔ اگر میں ناامید ہو چکا ہوتا تو تم سے یہ باتیں نہ کہتا۔ میں ان ٹیچرز سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور پر امید ہوں کہ وہ سوچیں گے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک عظیم طاقت ہے۔ آج یا کل دنیا انہیں ذمہ دار قرار دے گی اگر کچھ بُرا ہوا۔ یہ انتہائی مناسب ہوگا اگر کچھ ہونے سے پہلے کچھ کر لیا جائے۔

اگر میں تم لوگوں میں کبھی واپس آیا تو بتاؤں گا کہ محبت کی تعلیم کیونکر دی جاتی ہے۔ آج صرف تمہاری توجہ مبذول کرائی جا سکتی ہے۔ اس بارے میں توجہ کہ وہ تعلیم جس کی بنیاد ذہانت پر رکھی جائے وہ ایک فیکٹری تو ہو سکتی ہے لیکن معبد نہیں۔ میں اپنی بات کو اس وقت مکمل سمجھوں گا

اگر زندگی کا معبد معرض وجود میں آ گیا اور تعلیم کی بنیاد محبت پر رکھ دی گئی۔

بچپن...... چودہ سال کی عمر تک کا عرصہ...... محبت اجاگر کرنے کا بہترین موقع ہوتا ہے۔ اگر ہم نے اسے ضائع کر دیا تو پھر وہ ہمیشہ کے لئے ضائع ہو جائے گا۔ پھر کوئی طریقہ نہیں رہ جاتا کہ اس میں تبدیلی لائی جا سکے اور بچپن میں اس کی تبدیلی کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، جس محبت کے دھارے کو روانی بخشنی ہوتی ہے۔ ہمیں صرف موقع سے فائدہ اٹھانا ہے کہ اس بہاؤ کو جاری رہنے دیں۔ اس طرح ہم ایک نئے انسان کو جنم دیں گے اور ایک نئے انسان کی اشد ضرورت ہے۔

نہ تو ہائیڈروجن بم اور ایٹم بنانے کی اتنی ضرورت ہے اور نہ اسپٹنک اور خلائی جہازوں کی تاکہ چاند اور ستاروں تک پہنچیں، نہ اس بات کی اتنی ضرورت ہے کہ سمندر کی گہرائی کا پتہ لگائیں۔ اسی طرح اس کی بھی ضرورت نہیں کہ بڑی بڑی فیکٹریاں لگائی جائیں۔ یہ تمام چیزیں بے مقصد ہوں گی اگر آدمی کی حیثیت غلط ہو۔ سب کچھ فضول ہوگا۔

اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم صحیح آدمی کس طرح پیدا کریں؟ اس رخ پر توجہ دیں اور سوچیں۔

میں نے یہ چند باتیں جو کہی ہیں اسے تم لوگوں نے محبت اور خاموشی سے سنا...... میں انتہائی شکر گزار ہوں۔ اب آخر میں، میں آپ سب کو سلام پیش کرتا ہوں۔ برائے کرم قبول فرمائیے۔

انکار کی روشنی

جیسے انسان بوڑھا ہوتا ہے بالکل ویسے ہی سوسائٹی بھی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ جیسے آدمی مرتا ہے ویسے ہی سوسائٹی اور تہذیب بھی ختم ہو جاتی ہے اور کوئی شخص بوڑھا ہونے اور مرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک سوسائٹی، ایک تہذیب، اگر خواہش ہو تو بوڑھا ہونے سے انکار کر دیتی ہے حالانکہ وہ سوسائٹی جو ختم ہونے سے انکار کر دے اسے بہر حال نئی زندگی نہیں حاصل ہوتی۔ ختم ہونے سے انکار کر دینا تو آسان ہوتا ہے لیکن اگر نئی زندگی نہ ملے تو ایک طرح کی مردہ زندگی شروع ہو جاتی ہے۔

اس ملک کی تہذیب بہت عرصہ پہلے ہی نئی زندگی سے مایوس ہو چکی ہے۔ ہم اسی طرح ہیں جیسے کہ ہزاروں سال سے رہے ہیں۔ اگرچہ چند تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن وہ سب باہر سے ہوئی ہیں۔ ہمارے اپنے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اگر ہم نے کوئی ترقی کی ہے تو ہمیں دوسروں نے دکھایا ہے، خود ہمارے اندر سے کوئی دباؤ نہیں پڑا۔ ہم آگے بڑھے ہیں تو باہر کے دباؤ اور جبر کے تحت کیونکہ ہماری روح ماضی کی اسیر ہے۔

ہماری سوسائٹی ایسی ہی ہے جیسے ایک مردہ۔ جانے کب سے نئے شگوفے کھلنے بند ہو گئے۔ لیکن ہم ہیں کہ اس کی وجہ سے نہ ناخوش ہیں اور نہ فکر مند بلکہ اس سے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ہم یہی کہتے جا رہے ہیں کہ ہمارا صحیفہ سب سے زیادہ پرانا ہے، ہماری عبادت گاہ سے پرانی کوئی دوسری نہیں۔ ہم اس حقیقت سے بیگانہ ہیں کہ ہمارا پرانا ہونے کا دعویٰ دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اپنی کسی نئی زندگی کو روک چکے ہیں۔

وہ جو نئے ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں پرانی کو تج دیا ہے اور جو نئی زندگی کی اہلیت نہیں رکھتے پرانی سے چمٹے ہوئے ہیں اور پرانی کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں پرانے نام اور پرانے صحیفے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ سب مردہ بوجھ ہیں جس کے نتیجے میں روح تباہ ہو رہی ہے اور ملک کا وقار خاک میں مل رہا ہے۔ اس لئے زمین پر ہم سے زیادہ دکھی اور کوئی نہیں۔ ہمارا دکھ وہی ہے جو کسی تباہ حال سوسائٹی کا ہوتا ہے۔ ہمارا دماغ کسی پرانی عمارت

جیسا ہے۔ پرانا اور خستہ وخراب۔ گرد وغبار اور گندگی سے بھرا ہوا۔

جہاں زندگی کا بہاؤ رک گیا ہے۔ زندگی دکھی ہو چکی ہے' بدبودار اور غلیظ۔ اگر کسی دریا کو کسی طرح روک دیا جائے تو اس کا پانی گندہ اور بدبودار ہو جائے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف ہمارے شہروں کی سڑکیں گندگی کا ڈھیر ہیں بلکہ پورا کا پورا ملک انہی سڑکوں جیسا ہے۔ سڑکوں کی گندگی تو دکھائی دیتی ہے لیکن دماغ کی غلاظت نہیں دکھائی دیتی۔ ایک دن آئے گا جب ہم سڑکوں کو صاف کر دیں گے چاہے آج یا پھر کل لیکن چونکہ دماغ کی سڑکیں دکھائی نہیں دیتیں اس لئے اسے کون صاف کر سکتا ہے؟ باہر کی سڑکیں جلد ہی صاف ہو جائیں گی لیکن اندر کی سڑکیں اسی طرح گندی رہیں گی۔ جب تک کہ باہری سڑک صاف نہ ہو اندر تبدیلی نہیں آسکتی۔ ہمارے ملک میں بہت سی نئی چیزیں آرہی ہیں جس سے ہم موڈرن ہوتے جا رہے ہیں۔ روزانہ نئے بچے پیدا ہو رہے ہیں لیکن ہمارا ذہن اسی طرح پرانا ہے۔ یہ ہزاروں سال پرانا ہے' عام قسم کا پرانا نہیں۔

اگر ہم سوسائٹی کے رولز اور ریگولیشن کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم نے MANU MAHARAJ کے زمانے سے کوئی ترقی نہیں کی ہے۔ MANU کا زمانہ تین ہزار پانچ سو سال قبل کا ہے اور مانو نے شدھرا پیدا کیا جو ابھی تک زندہ ہے۔ آج بھی اگر کوئی شدھرا کو آزادی دلانے کی بات کرے تو اسے انقلابی سمجھا جاتا ہے۔ اگر شدھرا کے نشان کو مٹانے کی بات کی جائے تو اسے انقلابی عمل قرار دیا جاتا ہے' اس کا مطلب یہ ہوا کہ شدھرا ابھی تک بہت طاقتور ہے اور اونچی ذات والے اس سے خوف کھاتے ہیں۔ آخر کسی کا تین ہزار سال پرانا بنایا ہوا قانون کس طرح چل رہا ہے جسے ختم نہیں کیا جا سکتا؟

مجھے نہیں معلوم کہ کس وقت کس لمحے ہماری تاریخ نے فیصلہ کیا کہ آدمی اپنی قسمت کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ آدمی نے پوری دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے' ان میں وہ بھی شامل ہے جسے خدا کی طرف سے مقدر سمجھا جاتا تھا۔ آدمی کی عمر طویل ہوگئی' مہلک بیماریوں کا علاج ہونے لگا' اسی طرح بہت سی چیزیں بدل گئیں...... لیکن انڈیا اپنی قسمت کے مطابق زندگی گزار رہا ہے۔ قسمت کے متعلق ہم میں کوئی تبدیلی نہیں رونما ہوئی۔ ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ یونیورسٹی کا طالب علم فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے جوتشی کو اپنا ہاتھ دکھا رہا ہے اور پچیس پیسے دے رہا ہے۔ اس

ملک کا کیا بنے گا اگر یونیورسٹی کا طالب علم اپنی ہتھیلی کی لکیریں دکھا رہا ہو؟ وہ کبھی کبھی قسمت کو ماننے سے انکار بھی کرتا ہے لیکن امتحانات کے دنوں میں ہنومان کے مندر کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہوتا ہے۔

ہمارا ذہن بہت ہی پرانا ہے۔ ہم باہر سے نئے ہیں۔ ہمارے لباس کا انداز تبدیل ہو کر ویسا ہی ہو گیا ہے جیسا پوری دنیا میں پایا جاتا ہے لیکن ہماری اندرونی حالت ویسی ہی پرانی ہے۔ ہمارا لباس وغیرہ نئی طرز کا ہو چکا ہے' اس کی وجہ بھی ہم خود نہیں' بلکہ دوسروں کی کھینچا تانی تھی جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہماری اندرونی زندگی' جہاں باہر کا دباؤ نہیں ہو سکتا تھا' جہاں باہر سے کوئی کوشش نہیں تھی' ہم ویسے کے ویسے پرانے ہی رہے۔

میں کلکتہ میں ایک ڈاکٹر کے ساتھ تھا جس نے انگلستان سے ایف آر سی ایس (FRCS) کا امتحان پاس کیا تھا۔ کلکتہ میں وہ کافی مشہور تھا۔ ایک شام جب وہ مجھے لے کر ایک میٹنگ میں جا رہا تھا اور ہم ابھی عمارت کے پورچ سے نکلے ہی تھے کہ اس کی بیٹی چھینک دی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تھوڑی دیر ٹھہر جاتے ہیں کیونکہ وہ چھینک دی اور اسے بُرا شگون سمجھا جاتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''میرے باہر جانے کا اس کی چھینک سے کیا تعلق؟ چھینک مجھے جانے سے کیوں کر روک سکتی ہے؟''

اس نے کہا کہ ''میں جانتا ہوں لیکن ایک دو منٹ انتظار کر لینے میں کیا مضائقہ ہے؟''

میں نے کہا کہ اس کی چھینک سے میرے رکنے کا سوال نہیں لیکن توہم پر یقین نے پورے ملک کو کسی کام کی شروعات سے روک دیا ہے۔ اس قسم کا یقین انتہائی خطرناک ہے۔ ایک منٹ بلکہ ایک گھنٹے تک انتظار کرنا مسئلہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیسویں صدی میں توہم کی سوچ انتہائی غیر مناسب ہے۔ جب ایک ڈاکٹر کے اعتقادات کا یہ حال ہو' پھر تو بہت ہی اعتراض والی بات ہے۔

در اصل ہماری سوچ اتنی پختگی اختیار کر چکی ہے کہ ہم اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے سوچنا اور غور کرنا ترک کر دیا ہے۔ ہزاروں سال سے ہمیں پڑھایا جا رہا ہے کہ ہم نہ سوچیں۔ ایک ایسا شخص جو سوچنے کی قدرت رکھتا ہے اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا کیونکہ وہ

سرکشی اور بغاوت کو ابھارتا ہے اور وہ لوگ جو نہیں سوچتے ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے بھیڑ، وہ آدمی نہیں ہوتے۔ بھیڑیں ایک کے پیچھے دوسری چلتی رہتی ہیں۔ ان کے چلنے کی واحد وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے آگے والی چل رہی ہے اور پورا ریوڑ اسی راستے پر چلتا رہتا ہے۔

اگر کچھ ہندوستانیوں نے سوچنا شروع کر دیا اور پوچھا کہ ''تم اس طرح کیوں چل رہے ہو؟'' تو جواب ملے گا۔ ''کیونکہ میرے والد بھی اسی طرح چلتے ہیں۔'' یہ صرف ہماری ہی تذلیل نہیں ہے بلکہ یہ تحقیر ہمارے جد کی بھی ہے۔ ہم چاہے ایک ہزار سال تک کوشش کرتے رہیں جواب یہی ہوگا۔ کیونکہ یہ تو بہت دنوں سے ہو رہا ہے اور ہم وہی کچھ کر رہے ہیں۔

اب لوگ جان گئے ہیں کہ بارش کیوں ہوتی ہے۔ بارش کبھی مذہبی قربانیوں کی وجہ سے نہیں ہوا کرتی اور نہ کبھی ہوگی لیکن ہم اب بھی مذہبی قربانیوں کے ذریعے بارش کروانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ پوری دنیا اس بات سے آگاہ ہے کہ اگر نلکے میں پانی نہیں آ رہا تو اسے مذہبی قربانی سے نہیں لایا جاسکتا۔ پھر آسمان سے بارش کرانا کتنا دشوار ہے۔ اگر کنویں کا پانی خشک ہو جائے تو یہ ممکن نہیں کہ مذہبی قربانی کے ذریعے کنویں میں پانی لایا جاسکے۔ آسمان تو بہت دور ہے...... ہم وہاں سے بارش کس طرح کرا سکتے ہیں؟ لیکن ہندوستان کے لوگ مذہبی طریقے سے' آسمان سے بارش برسانے کی کوشش کئے جا رہے ہیں۔ بہرحال چند ممالک ایسے بھی ہیں جو سائنسی طریقوں سے آسمان پر بادل پیدا کر دیتے ہیں اور بارش ہو جاتی ہے اور جب بارش روکنا چاہتے ہیں تو بادلوں کو اڑا دیتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہم بھی کر سکتے ہیں لیکن اسی وقت جب پرانے خیالات سے پیچھا چھڑا لیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جادو منتر وغیرہ Holy Fire کی موجودگی میں کرنا چاہئے۔ ہمارا خیال ہے کہ صرف چاول' گندم' گھی وغیرہ آگ میں جلانا۔ وہ چیزیں جن کی کمی پہلے ہی ہےء۔ دوسری چیزیں پھینکنی چاہئے۔ لیکن یہ بھی نہیں کیا گیا ورنہ ہم نے بہت سی مذہبی قربانیاں دی ہوتیں اور ہندوستان کی سوسائٹی مالا مال ہو جاتی۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ امریکہ میں کبھی کوئی مذہبی قربانی دی گئی ہو لیکن وہاں آسمان۔ سے دولت کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ شاید روس نے اس قسم کی قربانی پر یقین رکھنے والوں کو دماغی ہسپتالوں میں بھیج دیا۔ اور ہم؟ اور ہم پانچ ہزار برسوں سے بلیدان کئے جا رہے ہیں' لیکن کوئی ہمارے پاگل پن پر سوال کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اگر آج

گجرات کی حکومت اس قسم کے بلیدان (قربانی) کی اجازت نہیں دیتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ گورنمنٹ ان قربانیوں کو غلط یا گناہ یا غیر مذہبی سمجھتی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے پاس اتنا غلہ نہیں ہے کہ وہ بلیدان کے لئے فراہم کر سکے۔ حکومت گندم کو آگ میں جلانے کی قربانی اس لئے نہیں کرنے دیتی کہ اس کی کمی ہے۔ حکومت کو یہ کہنا چاہئے کہ چاہے ہمارے پاس بہت زیادہ گندم کیوں نہ ہو' ہم اس طرح کے بلیدان کی اجازت نہیں دیں گے۔ لیکن حکومت میں اتنی ہمت کہاں' اس لئے کہتی ہے کہ ''ہمارے پاس اتنا گندم نہیں ہے کہ ہم راشننگ کا مسئلہ حل کر سکیں۔''

لیکن بلیدان کرنے والے بہت چالاک ہیں۔ وہ کہتے ہیں ''ہم بغیر گندم کے بلیدان کریں گے لیکن اس قربانی کو نہیں روک سکتے۔ ہم یہ منتر ضرور کریں گے اور اس کی جگہ آگ میں کچھ اور جلائیں گے اور بلیدان کو جاری رکھیں گے۔'' وہ لوگ جو ایسا بلیدان دیتے ہیں' قابلِ قبول دلیل نہیں دیتے۔ ایسے بلیدان کے ذریعے دنیا میں کیسے امن آسکتا ہے؟ ایک شخص بے آرام ہے تو کیا اسے بلیدان کے ذریعے پرسکون کیا جاسکتا ہے؟ دماغی اسپتال جاؤ اور انہیں یقین دلاؤ کہ ایک شخص کا بلیدان کے ذریعے علاج کیا جاسکتا ہے۔ جب پوری دنیا پاگل ہو رہی ہو تو کیا وہ تمہارے بلیدان کے ذریعے پرسکون اور پرامن ہو سکتی ہے؟ گندم ضائع کرنے کرنے کے باعث عظیم نقصان نہیں ہوا' ہم جب تک غلط علاج کرتے رہیں گے' اس وقت تک صحیح حل ناممکن ہے۔

اگر لوگ سمجھتے ہیں کہ نظر بٹو سے اتنا نقصان نہیں...... بس اتنا ہی ہوگا کہ ایک آدمی یا دس آدمی مر جائیں گے...... لیکن عظیم نقصان تو میڈیکل سائنس میں ترقی نہ ہونا ہوگا۔ میڈیکل سائنس اس وقت ترقی کریگی جب ہم امراض کی وجوہات کو بہ نظر غائر دیکھیں گے کہ کہاں سے اور کیوں مرض کی ابتداء ہوتی ہے۔ ہم میڈیکل سائنس کو سائنسی ذرائع سے ترقی دے سکتے ہیں۔ جھاڑ پھونک کرنے والے' ساحر یا صحیفوں کے اسکالر سے رجوع کر کے نہیں۔ مرض کا علاج کرنے کے لئے مرض کی وجوہات کا جاننا اور ان وجوہات کو ختم کرنے سے ہوگا۔

امریکہ' سویڈن' سوئزرلینڈ اور دوسرے ممالک میں مہلک بیماریاں نہ ہونے کے برابر ہو کر رہ گئیں اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان اتنا صحت مند اس سے قبل کبھی نہیں تھا۔ عمریں بڑھ گئیں

ہیں۔روس میں 1917ء کے انقلاب کے دوران' روسیوں کی اوسط عمر 23 سال تھی۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر سال ان کی عمروں میں ایک سال کا اضافہ ہوا۔سویڈن اور سوئز رلینڈ میں اوسط عمر کی توقع 82 سال ہے۔سائنسدانوں اور مفکرین کا کہنا ہے کہ اوسطاً سو سال کی عمر تک پہنچنے کی خواہش اتنی زیادہ مشکل نہیں ہے۔اگر اوسط عمر سو سال ہوگئی تو تمہیں وہاں دو سو اور ڈھائی سو سال کے لوگ بھی ملیں گے۔ہمارے اپنے ملک میں جہاں اوسط عمر تیس سال ہوتی ہے' وہاں ہمیں 90 برس کے لوگ ملتے ہیں۔یعنی اوسط عمر کا تین گنا۔چنانچہ تین سو سال کے آدمی کا ملنا آسان ہوگا اگر اوسط عمر بڑھ کر ایک سو سال ہوگئی۔اس وقت روس میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جن کی عمریں ڈیڑھ سو سال تک ہیں۔

پوری دنیا ہر چیز تبدیل کر رہی ہے لیکن ہندوستان کا ڈھانچہ اپنی جگہ قائم ہے۔ہم کہتے جارہے ہیں کہ ہمارے پاس گندم کی کمی ہے' کپڑے کی قلت ہے اور اس بات کو ہم اس طرح کہتے ہیں جیسے ہم مجبور ہیں۔ہم گزشتہ پانچ ہزار برسوں سے بھوکے اور ننگے ہیں......لیکن ہمارا طرز رہائش ایسا ہے جیسے ہم اگلے پانچ ہزار سال تک ویسے ہی رہیں گے۔اس میں ہماری زمین اور آسمان کا کوئی قصور نہیں بلکہ غلط اندازِ فکر ہے۔

1940ء میں روس نے اپنی ٹرینوں میں کوئلے کی بجائے گندم جلائی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ گندم کے مقابلے میں کوئلہ زیادہ قیمتی ہے۔گندم ہر سال پیدا کی جاسکتی ہے جبکہ کوئلے کو زمین کے اندر بننے میں لاکھوں برس لگتے ہیں۔چنانچہ کوئلہ کفایت سے استعمال کیا جانا چاہئے۔اب اس دنیا میں ایک ملک کے لوگ ٹرین کے انجنوں میں گندم جلا رہے ہیں اور دوسرے ملک کے لوگوں کے پاس پیٹ بھرنے کے لئے بھی گندم نہیں۔ایسی صورتحال میں حیرت کا ہونا کیا معنی۔

ایسا نہیں ہے کہ امریکہ شروع سے ہی مالدار ملک تھا۔اس نے دولت گزشتہ پچاس یا ساٹھ برس قبل پیدا کی ہے' ورنہ وہ بھی اتنا ہی غریب تھا جتنے کہ ہم ہیں۔اور یاد رکھو امریکہ میں ریڈ انڈینز یعنی وہاں کے باسی اب بھی غریب ہی ہیں۔امارت کی وجہ امریکہ کی زمین نہیں ہے۔

جرمن کا ایک مفکر کاؤنٹ کیسرلنگ' انڈیا کے دورے کے بعد واپس گیا۔اپنی کتاب میں اس نے ایک واقعہ لکھا ہے۔جب میں وہ پڑھ رہا تھا تو مجھے سخت حیرت ہوئی تھی۔اس نے لکھا تھا کہ ہندوستان ایک بہت امیر ملک ہے جس میں غریب لوگ بستے ہیں۔میں سوچ رہا

تھا۔"یہ کس طرح ممکن ہے؟ اگر ملک امیر ہے تو لوگ کس طرح غریب ہو سکتے ہیں اور اگر لوگ غریب ہیں تو ملک کو کس طرح امیر ملک کہا جاسکتا ہے؟" پھر میری سمجھ میں آیا کہ اس نے طنزیہ انداز میں کہا ہے وہ اصل میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ عوام امیر ہو سکتے ہیں لیکن ان کی ذہانت' ان کا دماغ' ان کی سوچ نے انہیں غریب رکھا ہوا ہے۔وہ امیر نہیں ہو سکتے۔ہاں اگر امریکی عوام جیسے لوگ یہاں ہوں تو یہ ملک امریکہ سے زیادہ امیر ہوسکتا ہے۔ہمارے پاس ہر چیز ہے سوائے غور و فکر والے دماغ کے۔ہزاروں سال سے ہماری عادت سوچنے کی نہیں رہی۔اگر سوچنے کا موقع ہوتا ہے تو ہم اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔اگر ہمارے سامنے کوئی مسئلہ ہو تو ہم سیدھے عبادت گاہ پہنچ جاتے ہیں۔اس مسئلے کے حل کے متعلق نہیں سوچتے۔

جلد ہی میں بہار میں تھا۔ہزاروں خاندان بدھا کے زمانے سے بہار میں آباد ہیں لیکن بہار کے لوگوں نے کچھ نہیں کیا۔پانی کے بہت بڑے ذخائر بہار کی زمین میں موجود ہیں لیکن وہ کنواں نہیں کھودتے۔ہر سال وہ قحط کا انتظار کرتے ہیں اور زندگی کے لئے مدد کی بھیک مانگتے ہیں۔خود کچھ نہیں کرتے۔جب قحط ہوتا ہے تو اسے قبول کرتے اور بھیک مانگتے ہیں۔جب قحط ہوتا ہے تو ملک کے سارے لیڈر عطیات مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔قحط کے خاتمے کے بعد سب بے فکر ہو جاتے ہیں۔صورتِ حال جوں کی توں جارہی ہے' اس طرح وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

ایک ممتاز ماہر معاشیات نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام 1975ء ہے۔اس کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ 1975ء اور 1980ء کے درمیان اس ملک میں بہت بڑا قحط پڑے گا جس میں دس سے بیس کروڑ انسان لقمۂ اجل بن جائیں گے۔اس کی پیش گوئی ہے کہ یہ اتنا بڑا قحط ہوگا کہ دنیا کی تاریخ نے نہ دیکھا ہوگا۔لیکن ہم اسے پڑھنے کے باوجود اسی طرح رہ رہے ہیں جیسے پہلے رہ رہے تھے۔1978ء آنے دو ہم دیکھیں گے۔ہم خدا کی خدمت میں بلیدان پیش کر دیں گے۔ہمارے ساتھ ہمیشہ خدا ہوتا ہے اور اگر وہ نہ ہوا تو سادھو اور راہبین تو کم از کم ہمارے ساتھ ہوں گے۔ہم ان سے پرارتھنا (دعا) کریں گے۔ہم ان سے ہمیشہ پرارتھنا کرتے ہیں اور وہ ہمیں ہمیشہ بہکاتے ہیں۔وہ ہمیں وہی بتائیں گے جو انہوں نے ہزار ہا بار بتائی ہے جس کا کبھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔لیکن ہم ہیں کہ سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔

وہی لوگ آئیں گے اور ہم انہی سے پوچھیں گے۔ ہم نے صورتحال کے مطابق کبھی اپنا دماغ استعمال کرنے کے متعلق سوچا تک نہیں۔

اب ہمیں سوچنا ہوگا' ورنہ مستقبل قریب میں نہ صرف ہم غربت اور بھوک کا شکار ہوں گے بلکہ ہماری روحیں تک غربت اور بھوک کا شکار ہو جائیں گی۔ جیسا کہ ہم سے قبل لوگوں کے ساتھ ہو چکا ہے' ہماری روحیں اور شعور پستی میں جا سکتا ہے۔ اگر ہم اسی طرح زندگی گزارتے رہے تو ہم میں اور قرونِ اولیٰ کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا جو جنگلوں میں زندگی گزارا کرتے تھے۔ پچاس برسوں کے دوران ہماری حالت ویسی ہی ہوگی اور قرون اولیٰ کے لوگوں اور ہم میں فرق اتنا بڑھ جائے گا جتنا فرق ہم میں اور امریکہ' روس اور یورپ میں اس وقت ہے۔

آج بھی دنیا ہم سے خوف زدہ ہے کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارا بھکاری ملک اتنا زیادہ مانگا کرتا ہے کہ وہ ہماری ضروریات پوری نہیں کر سکتے۔ اب بھی وہ ہمارے ساتھ کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بیس سال پہلے وہ سوچتے تھے کہ اگر انہوں نے ہماری مدد کر دی تو شاید سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ہم نے ان کی مدد لے کر صرف آبادی بڑھائی۔ ہم اپنے مسائل بڑھا رہے ہیں۔ اس وقت ان کے لئے ہماری صورتحال ناخوشی کا باعث ہے۔ اگر غریب مشرقی ممالک خاص طور سے انڈیا جیسے' اسی طرح آبادی میں اضافہ کرتے رہے اور اس طرح لباس اور خوراک میں کمی کا شکار رہے تو اس بڑی تکلیف کو نظر انداز کرنا مشکل ہو جائے گا کہ دنیا کے ایک حصے میں غربت کی انتہا ہو اور دوسرا حصہ دولت سے سرشار ہو۔

لیکن ہم کر کیا رہے ہیں؟

ہم اپنی زندگی کے اردگرد مسائل کو دیکھیں۔ ہم اخبارات لے کر پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ ہم کوئی غور و فکر نہیں کر رہے ہیں' ہم اپنے ملک کے مسائل کے متعلق سوچتے تک نہیں۔ ہم کیا سوچ رہے ہیں؟ ہم اس بحث میں پڑے ہوئے ہیں کہ دریائے نربدہ کا پانی کس کا ہے' مدھ پردیش کا یا پھر گجرات کا؟ ہم جیسے بے وقوف لوگوں کا ملنا دشوار ہے۔ ہمارے اخبارات اس تنازعہ میں الجھے ہوئے ہیں کہ ایک ضلع میسور میں آتا ہے یا مہاراشٹرا میں۔ گولیاں معصوم لوگوں پر چلیں گی۔ ہمارے مسائل' مسائل نہیں بلکہ بیماریاں ہیں۔ ہم زندگی کے ان مسائل کو حل

کرنے کے متعلق نہیں سوچ رہے ہیں جس کا ہمیں سامنا ہے۔ جب یہ مسائل ہمیں دبوچ لیتے ہیں تو ہم چلاتے اور روتے ہیں۔ پھر اس کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ خدا سے دعا کریں۔ جب ہم اپنے مسائل کے حل کے لئے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں تو اسے فضول تنازعات کی نذر کر دیتے ہیں اور جب بعد میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوتے تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ خدا سے دعا کریں۔

یاد رکھو خدا بھی ان کی نہیں سنتا جو صرف دعا کرتے ہیں۔ وہ انہی کی سنتا ہے جو سخت محنت کرتے ہیں۔ اتنی کہ خدا محسوس کرتا ہے کہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ خدا ہر جگہ ہے اور وہ انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد خود بھی کرتے ہیں۔

سوامی راما جاپان گئے۔ کشتی میں ایک جرمن موجود تھا جس کی عمر 80 برس تھی۔ اس عمر میں وہ چینی زبان سیکھ رہا تھا۔ چینی زبان سیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ دنیا میں اتنی مشکل کوئی دوسری زبان نہیں جیسی کہ چینی زبان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زبان میں حروف ہجا (ALPHABET) نہیں ہوتے۔ یہ تصویری زبان ہے۔ ہر لفظ کے لئے ایک تصویر ہے۔ اگر تم کسی زبانی لڑائی یا جنگ کی صورت بیان کرنا چاہو تو اس کے لئے لفظ نہیں' تمہیں ایک تصویر بنانی ہوگی کہ دو عورتیں ایک چھت کے نیچے بیٹھی ہوئی ہیں' اس کا مطلب ہوگا کہ وہ لڑ رہی ہیں۔ چنانچہ کم از کم ایک لاکھ الفاظ یاد کرنے ہوں گے صرف معمولی شدہ بدھ کے لئے۔ وہ 80 سالہ شخص چینی زبان سیکھنے کی کوشش کر رہا ہے...... کیا وہ پاگل ہے؟ راما سوچ رہا تھا کہ اس بوڑھے شخص کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ وہ صبح سے پڑھ رہا تھا' اسے نہیں معلوم کہ سورج کب غروب ہوا۔ جب اندھیرا ہو گیا اور اس کی بوڑھی آنکھیں تھک گئیں تو وہ اپنی کیبن میں واپس آ گیا۔

تین دنوں بعد راماٹرتھا نے اس سے پوچھا' کیا تمہیں معلوم ہے کہ چینی زبان سیکھنے میں دس سال کے قریب لگتے ہیں۔ اس نے یہ بھی پوچھا کہ اس کی عمر کتنی ہے۔ بوڑھے شخص نے جواب دیا۔ "خدا نے ہی میری عمر گن رکھی ہوگی' میرے پاس ان فضول چیزوں کو جاننے کا وقت نہیں ہے۔"

راماٹرتھا نے کہا۔ "ٹھیک ہے' لیکن اسے سیکھنے میں دس برس لگیں گے جبکہ تمہاری عمر دس سال سے کم رہ گئی۔"

بوڑھے شخص نے جواب دیا۔ ''میرا نوے سال کا تجربہ مجھے کہتا ہے کہ میں 90 سال تک جیا حالانکہ کسی بھی وقت مر سکتا تھا۔ میں نے موت کو نوے برس تک دھوکہ دیا کیونکہ میں اب تک نہیں مر سکا۔ میں ابھی اور زندہ رہوں گا۔ اور کیا میں تمہاری عمر پوچھ سکتا ہوں؟''

راماٹرتھا کو سخت شرمندگی ہوئی کیونکہ وہ ابھی تک 30 سال کا ہی تھا۔ بہرحال اس نے بتایا کہ اس کی عمر تیس سال ہے، جس کے جواب میں بوڑھے شخص نے کہا۔ ''میرے بیٹے، میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارا ملک کیوں بوڑھا ہوا۔ دراصل تم لوگ اپنے ملک میں کچھ نہیں کرتے، سوائے موت کے انتظار کے۔ تمہیں تو بوڑھا ہونا ہی ہے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ اگر خدا موجود ہے (یقیناً ہے) تو وہ اس بوڑھے شخص پر اپنا رحم کرے گا جو اتنا ثابت قدم ہے۔ اگر خدا موجود نہیں، میں اس کے متعلق ایسا نہیں سمجھتا، بہرحال اگر خدا ہے تو وہ اسے طویل عمر دے گا۔ یہ بات میرے علم میں، بعد میں آئی کہ وہ پندرہ سال تک مزید جیا۔ اس نے نہ صرف چینی زبان سیکھی، نہ صرف چینی کتب پڑھیں بلکہ چینی زبان میں ایک کتاب لکھ کر چھوڑ گیا۔ راماٹرتھا اس کے دو برسوں بعد مر گیا لیکن اس بوڑھے شخص نے 105 سال کی عمر پائی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی طرز زندگی نے اسے طویل عمر تک زندہ رہنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

دنیا میں لوگوں نے ریگستان کو سرسبز کھیتوں میں تبدیل کیا ہے جبکہ یہاں ہندوستان میں ہمارے کھیت آہستہ آہستہ صحرا میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ بہت سے مقامات پر خدا نے ہر چیز پیدا کی جہاں پہلے کچھ نہ اگتا تھا۔ جہاں بارشیں نہیں ہوتی تھیں وہاں دریاؤں کو فراوانی سے بہایا۔ اس نے بہت سی چیزوں کو پیدا کیا جہاں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جہاں ریت کے ٹیلے ہوتے تھے اور آدمی داخل نہیں ہو سکتا تھا وہاں خوب صورت شہر وجود میں آ گئے ہیں۔ چنانچہ اگر خدا ہے تو وہ مجبور لوگوں کی دعائیں سن رہا ہوگا۔

ہماری بے مصرف دعائیں نہیں سنی گئیں...... آج تک، ایسی دعائیں کہیں نہیں سنی جاتیں، پھر بھی ہم ابھی تک وہی دعائیں کئے جا رہے ہیں۔ نہیں، ایسے کاہل الوجود لوگوں کی دعائیں کبھی نہیں سنی گئیں اور نہ کبھی سنی جائیں گی۔ پھر بھی ہم غور و فکر کے لئے تیار نہیں ہیں، ہم نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے بچے بھی نہیں سوچتے۔ ہم بس اندھے مجمعے کی مانند چل رہے ہیں، کیا یہ

صحیح ہے؟

میں ملک میں ہر جگہ یہ سوال کرتا ہوں، کیا یہ مناسب ہے کہ ہم اندھے لوگوں کی طرح چلتے رہیں۔ ہم اپنی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا ہم کو اپنی زندگی کی بہتری کے لئے کوششیں کرنی چاہئے؟

لیکن نہیں، ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہاں زندگیوں کو بہتر بنانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہم نے اپنی موجودہ زندگیوں کے متعلق ایسی توضیح کر رکھی ہے جو ہم سے کہہ رہی ہے کہ سوچ بچار کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس بارے میں کام کرنے کی کوئی حاجت نہیں اور یہ کہ کسی تبدیلی کی بھی کوئی ضرورت نہیں اگر کوئی شخص غریب ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ اپنی قسمت کی وجہ سے غریب ہے۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ امیر ہے تو اپنی قسمت کی وجہ سے ہے۔ پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام لوگ بدقسمت ہیں اور خدا امریکہ سے بہت خوش ہے اور تمام خوش قسمت لوگوں کو امریکہ میں پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی شخص غریب ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس نے اپنی پرانی زندگی میں کوئی پاپ کیا ہوگا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ پچھلی زندگی میں اسے اچھے کام کرنے تھے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اس ملک کو جہنم سمجھتا ہے اور تمام گناہ گاروں کو یہاں بھیج رہا ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ ہندوستان میں تمام گناہ گار لوگ پیدا ہو رہے ہیں اور خوش نصیب لوگ کہیں دوسری جگہ پیدا ہو رہے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ سارے گناہ گار ہندوستان میں پیدا ہوں؟

نہیں، اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں۔ ہمیں غربت ختم کرنے کے لئے سوچنا ہوگا جو ہم نے ابھی تک نہیں کیا ہے۔ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ غریب لوگ پہلے جنم کے کرتوتوں کی وجہ سے غربت کا شکار ہیں لہٰذا اب سوچنے کی ضرورت ہی نہیں، بات ختم ہوگئی۔ اب تم اپنی دوسری زندگی کو اچھا بنانے کے لئے کوشش کرو کیونکہ موجودہ زندگی میں پہلے جنم کے متعلق کچھ نہیں کر سکتے جس کی وجہ سے اس جنم میں مبتلائے مصیبت ہو۔ ماضی تو ماضی ہے، مستقبل کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ چنانچہ آج ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہئے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح ہم نے خود کو آج کچھ نہ کرنے سے بچا رکھا ہے۔

ہمیں اپنی ہلاکت کی سوچ کو چھوڑنا ہوگا۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں

وہ درست ہے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ کوئی جو کچھ بھی کہتا ہو، وہ اس لئے سچ نہیں ہوسکتا کہ وہ کون کہہ رہا ہے۔ ہم سب کو شعوری طور پر مل کر سوچنا ہے۔ ہر سوال کو بار بار اٹھانا ہے۔ یہ تمام سوالات پورے ملک کے سامنے پیش کرنا چاہئے۔ ہمیں مستقبل کی نسل کو اس یقین کے ساتھ پروان نہیں چڑھانا چاہئے۔ ہم ہر یقین پر بہت دنوں تک قائم رہے ہیں، اب ہمیں سوچنے کا عمل شروع کیا جانا چاہئے۔

ہمارے اسکول اور کالجوں کی پڑھائی ایسی ہے کہ وہ جب تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں تو ان میں غور و فکر کی اہلیت نہیں ہوتی۔ جب وہ سائنس پڑھ کر نکلتے ہیں تو ان کے دماغ کا ڈھانچہ ویسا ہی پرانے کا پرانا رہتا ہے۔ وہ سائنس پر دسترست حاصل کرتے ہیں تو اندھے لوگوں کی طرح۔ وہ اس بات کا ادراک بھی نہیں رکھتے کہ اندھوں کی طرح سائنس پر دسترست انتہائی خطرناک ہے کیونکہ سائنس میں روزانہ تبدیلی آتی رہتی ہے۔ جب ہم یونیورسٹی سے نکلتے ہیں یا وہیں تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں تو بھی سائنس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اندھوں کی طرح سائنس کا پڑھنا بے کار ہے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ لوگوں کو سوچنا بلکہ گہری نظر سے غور و فکر کرنا چاہئے تاکہ وہ زندگی کے مسائل کو براہ راست حل کر سکیں۔

ہمارے جیسے بڑے ملک میں سوچ کا عمل آزاد ہونا چاہئے۔ شاید ہم اپنی زندگی کے ہر شعبہ کو تبدیل کر سکیں۔ کیا ہمارا غریب رہنا ضروری ہے، یہ تو ہماری جہالت ہے جس نے ہمیں غریب بنا رکھا ہے۔ اب ہمیں بے شمار امراض کا شکار نہیں ہونا ہے، یہ تو ہماری جہالت ہے جس کے باعث ہم بیمار رہتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ دنیا کو جہنم بنایا جائے۔ سائنس نے عظیم امکانات پیدا کر دیئے ہیں کہ اگر ہم صحیح طور پر غور و فکر کریں تو یہ دنیا جنت بن سکتی ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے کیونکہ ہمارا دماغ بوڑھا ہے اور ڈھانچہ بھی۔ سارے دماغ بند ہیں۔ ویسے ہی جیسے کوئی شخص اپنے گھر کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اس میں بیٹھ جائے۔ وہ نہ کھڑکیاں کھولتا ہے اور نہ دروازے، نہ سورج کی کرنیں داخل ہوتی ہیں اور نہ تازہ ہوا۔ اسی میں گل سڑ کر مر رہا ہے۔ ہم نے بھی اسی طرح خود کو بند کر رکھا ہے۔

نہیں، ہمارے دماغ کو ہر طرف سے کھلا ہونا چاہئے۔ ہمیں گیتا پر شبہہ ہونا چاہئے اسی طرح Ramayana پر شبہہ ہونا چاہئے۔ اسی وقت ہمارا دماغ کھلا ہوا اور آزاد ہوگا۔ پھر ہم

سوچنا شروع کر دیں گے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ مہاویرا حاضر و غیب کا علم رکھنے والا تھا۔ اس کو جس بات کا علم تھا وہ ہمیشہ کے لئے درست تھا۔ اس نے صحیفہ میں چاند کے متعلق جو بھی لکھا صحیح ہے...... ایسی باتیں تو شنکرا چاریہ بھی کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے چاند پر کسی نے قدم نہیں رکھا، یہ جھوٹی افواہیں ہیں، دوسری بات یہ کہ اگر وہ چاند پر پہنچ گئے ہیں تو یہ چاند وہ نہیں جس کا ذکر صحیفوں میں ہے۔ وہ چاند تو بہت، بہت دور ہے۔ ذرا دیکھو ہم نے اپنا دماغ کس قدر بند کر رکھا ہے۔

ایک بوڑھی عورت آئی اور مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تم نے سنا کہ شنکرا چاریہ نے کیا کہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں میں نے سنا ہے اور اگر ہمارا ملک اتنا ہی پاگل ہے تو ایسے لوگوں کا دماغی علاج کرانا چاہئے۔''

اس بوڑھی عورت نے کہا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟ وہ ہمارا سب سے بڑا استاد ہے۔ اس نے جو کہا ہے وہ صحیح ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تمہیں صحیح لگتا ہے اور یہ تمہیں صحیح لگتا رہے گا کیونکہ تمہارا دماغ بھی اسی طرح بند ہے جیسے اس کا۔''

لیکن یہ زیادہ دن نہیں چلے گا۔ آج نہیں تو کل ان کے پاگل ہونے کا ثبوت مل جائے گا، ان کے تمام ماننے والوں کا بھی۔ اگر ہم میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

ابھی جلد ہی میں پٹنہ میں شنکرا چاریہ کے ساتھ ایک چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ شنکرا چاریہ نے کہا کہ عورتوں کو تعلیم دلوانا ضروری نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہندوازم نے عورتوں کو بہت عزت دے رکھی ہے اس لئے ضروری نہیں کہ انہیں تعلیم دی جائے۔ اس نے ایک اور دلچسپ بات کہی اور ہر شخص بغیر کسی احتجاج کے سنتا رہا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مغرب میں اگر کوئی عورت ڈاکٹر بننا چاہے تو وہ میڈیسن پڑھتی ہے۔ ہمارا ہندو مذہب کتنا اچھا ہے کہ اگر کسی عورت کی شادی ڈاکٹر سے ہو جائے تو لوگ اسے ڈاکٹرنی کہنے لگتے ہیں۔ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور سامنے بیٹھی ہوئی عورت نے تالی بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ وہاں موجود سب ہی لوگ خوش تھے کہ انڈیا میں ڈاکٹرنی بننا کتنا آسان ہے۔ ضروری نہیں کہ ڈاکٹری کی تعلیمات حاصل کی جائیں۔ بس ڈاکٹر کی بیوی ہو جانا کافی ہے۔ اگر یہی سوچ ہے تو کیا ہم سوچتے ہیں یا نہیں؟

ہم ایسی باتیں سن رہے ہیں اور مسلسل سنے جا رہے ہیں۔ ہم ایسی باتیں اور کام کرتے

ہیں کہ پوری دنیا ہم پر ہنستی ہے۔ پوری دنیا حیران ہوتی ہے کہ اس ملک کو کیا ہو گیا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ پورے ملک نے طویل عرصے سے سوچنا چھوڑ رکھا ہے اور ان کا ذہن زنگ آلود ہو چکا ہے۔ ایسا ہوتا ہے، اگر تم طویل عرصے تک چلنا پھرنا چھوڑ دو یا اپنے پیروں کی دو سالوں تک باندھے رکھو تو تمہارے پیر چلنے پھرنے کی اہلیت ختم کر دیں گے۔ اس طرح پیروں کی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ اگر دو سال تک کوئی تاریکی میں رہے یا آنکھیں بند ہوں تو پھر وہ سورج کی روشنی دیکھنے کی اہلیت کھو دے گا۔ روشنی دیکھتے ہی آنکھیں بند کر لے گا تو آنکھیں دیکھنے کی صلاحیت ختم کر دیں گی۔ روشنی خوف بن جائے گی۔ اگر نسلِ انسانی، سوسائٹی یا کوئی شخص ہزاروں برس سے نہ سوچ رہا ہو تو اس کے سوچنے کی اہلیت ختم ہو جائے گی۔

ہم اگر کچھ کرتے رہتے ہیں، ہم جو بھی کرتے ہیں، اس عمل سے تیزی آتی ہے۔ ہم جو کچھ کرتے رہیں تو اس سے مہارت بڑھتی رہتی ہے اور چابک دستی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ہم جو کام نہ کریں اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ہم نے سوچنا ترک کر رکھا ہے چنانچہ ہمارے غور و فکر کی صلاحیت زنگ آلود ہو گئی ہے۔ اس لئے ہم کچھ بھی سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہے۔ ہم زندگی کے دھارے میں مجبوروں کی طرح کھڑے ہوئے ہیں، جس کے پاس قوت نہیں ہے بس اِدھر اُدھر کھنچتے رہتے ہیں۔ اگر غلامی کا دور ہو تو ہم غلام بن جاتے ہیں، اگر آزادی آتی ہے تو آزاد ہو جاتے ہیں۔ آزادی کو بھی غلامی کی طرح قبول کر لیتے ہیں۔ ہمارے اندر کچھ نہیں ہوتا۔ اگر کل دوبارہ غلامی کا دور آیا تو ہم غلام بن جائیں گے۔ ہمیں کوئی فکر نہیں۔ اگر ہم غربت کا شکار ہیں تو ٹھیک، اگر قحط پڑا، ہم مر گئے تو بھی ٹھیک۔ اگر سیلاب آتا ہے تو بھی ٹھیک۔ جو کچھ بھی ہو ہمیں قبول۔

کیا ہم انسان ہیں یا مشین جیسے ہو چکے ہیں اور جو کچھ بھی ہو رہا ہو دیکھتے رہتے ہیں؟ کیا ہماری زندگی میں کوئی چیلنج نہیں، کیا ہمیں اپنی زندگی کی تبدیلی کی کوئی فکر نہیں؟ کیا ہم نے اپنی روح غائب کر دی ہے؟ ہم مسلسل روح کی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ روح مارکیٹ میں ریڈی میڈ ملتی ہے، ہم بس جا کے لے آئیں گے۔ یا پھر ہم صحیفوں کو پڑھ کر روح کو حاصل کر لیں گے؟ یا پھر ''رامانا ما'' کو پڑھتے رہنے سے روح مل جائے گی؟ روح ان لوگوں کو ملتی ہے جو مسلسل زندگی کی غلاظتوں سے لڑتے رہتے ہیں۔ سارے دکھوں سے، جہالت اور زندگی کی

تاریکیوں سے۔ روح جدوجہد اور باطل سے جنگ کا پھل ہے۔

ایسے لوگ جو سچائی کو چھوڑ دیں تو صرف کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔ اگر تمہاری ملاقات کسی غریب سے ہو تو وہ بس پیسے کے متعلق گفتگو کرے گا۔ اگر تم کسی مریض سے ملو گے تو وہ صحت کے متعلق بات کرے گا۔ صحت پر کوئی گفتگو نہیں کرتا سوائے بیماروں کے۔ ایک صحت مند شخص بس زندہ رہتا ہے۔ وہ کب گفتگو کرے گا؟ بیمار آدمی ہمیشہ خاموش بیٹھا رہتا ہے اور بات کرتا ہے تو صحت کے متعلق؟ وہ کتاب پڑھ کر یہ جاننا چاہتا ہے کہ صحت کیا ہوتی ہے، صحت مند کس طرح رہا جاتا ہے، صحت کی تعریف کیا ہے۔ اگر صحت خراب ہو جائے تو صحت کا مطلب اور معنیٰ سمجھنے میں وقت لگتا ہے۔ ایک صحت مند آدمی صحت مند زندگی گزارتا ہے...... کیا اس کے پاس وقت ہوتا ہے کہ صحت کے بارے میں جانے۔ جب ایک شخص کی روح غائب ہو جائے تو وہ ہر جگہ روح کے متعلق بات کرتا ہے۔ اسی طرح اگر خدا نہ مل رہا ہو تو وہ خدا پر گفتگو کرنے لگتا ہے۔ یعنی لوگ اسی پر گفتگو کرتے ہیں جو نہ رہی ہو۔

ہم چونکہ روح پر اتنی گفتگو کرتے ہیں تو کیا اس کا مطلب ہے کہ ہم روح سے واقف ہیں۔ نہیں، ہم روح کو قطعی نہیں جانتے۔ ہم نے روح کو جاننے کے لئے کچھ کیا ہی نہیں۔ ہم نے نہ تو اس کے متعلق سوچا اور نہ جدوجہد کی۔ جب ہم نے اس کے متعلق کوئی چیلنج قبول ہی نہیں کیا تو روح کیسے پیدا ہو گی؟ ہم نے روح کو پکارا ہی نہیں۔ ہم صرف روح پر باتیں کرتے ہیں۔

میں ایک واقعہ بیان کروں گا اور پھر اپنی بات ختم کروں گا۔

میرے ایک دوست نے امریکہ سے ایک پمفلٹ بھیجا۔ اس پمفلٹ میں ایک دلچسپ مضمون تھا۔ اس مضمون میں دنیا کی بہت سی قوتوں کے متعلق لطائف موجود تھے۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ اگر تم کسی انگریز کو خوب شراب پلا دو تو وہ خاموش ہو جائے گا۔ تم اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلوا سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز ہمیشہ خاموش رہتے ہیں۔ اگر تم کسی انگریز کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہے ہو تو وہ شاید تمہاری موجودگی تک سے بے خبر ہو۔ چاہے تم اس کے چوبیس گھنٹوں کے ساتھی کیوں نہ ہو، وہ خاموش ہی رہے گا۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو اپنے اندر بند ہو۔ وہ تم سے گفتگو نہیں کرے گا۔ لیکن جب تم اسے نشہ پلا دو گے تب اس کی خاموشی مزید بڑھ جائے گی اور وہ کوئی بات نہیں کرے گا۔ اگر فرانسیسی پر نشہ چڑھے تو وہ ناچنے لگے گا جیسا کہ

زندگی میں کرتا رہتا ہے، وہ گانے اور ناچنے لگتا ہے۔ اگر ڈنمارک کے لوگ نشے میں ہوں تو وہ بسیار خور بن کر کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ ایسا ہی ہوتا ہے، اگر کھانے کی میز پر بیٹھ جائے تو اسے وہاں سے ہٹانا مشکل ہوتا ہے۔

ایسے ہی اس مضمون میں ہر قوم سے متعلق لطائف درج تھے لیکن ان میں ہندوستانیوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ میرے دوست نے مجھ سے پوچھا۔ ''اگر ایک ہندوستانی نشے میں ہو تو کیا کرتا ہے؟''

میں نے جواباً کہا کہ اس سوال کا جواب سب لوگ جانتے ہیں۔ وہ اگر نشے میں ہو تو روح اور خدا پر لیکچر دینے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غربت کی وجہ سے وہ زیادہ شراب تو نہیں پی سکتا، اسی لئے بغیر نشے میں آئے وہ روح اور دیوتاؤں کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ ہم ہندوستانی باتونی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہم نے زندہ رہنا اور کچھ کرنا ترک کر دیا ہے کیوں کہ سوچنا چھوڑ دیا ہے۔

غور و فکر کرنا، انسان کی انتہائی ممتاز صفت ہوتی ہے، بنیادی خصوصیت۔ زندگی کی معاون سوچ ہی ہوتی ہے۔ اسی سوچنے کی اہلیت کی بناء پر آدمی، جانوروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر آدمی سوچنا چھوڑ دے تو وہ جانور ہو جائے گا۔ ہندوستان میں صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے۔ اگر تم کسی گاؤں میں جاؤ تو دیکھو گے کہ لوگ وہیں پڑے سو رہے ہوں گے جہاں ایک گائے بندھی ہوگی یا پھر ایک بھینس یا بیل کسی کھونٹے سے بندھا ہوگا۔ آدمی وہیں سو رہا ہوگا۔ اگر تم بغور جائزہ لو تو معلوم ہوگا کہ جانوروں اور آدمیوں میں کافی مماثلت ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور خاموشی کے ساتھ باہم زندگی گزارتے ہیں اور لوگوں کا ''گائے'' کو ماں کہنا گائے کی ذرّیات (اولاد) ہونے سے مختلف نہیں۔

ہم نے غور و فکر چھوڑ کر دراصل پوری انسانیت کی جدوجہد کا راستہ چھوڑ دیا ہے۔ بس جانوروں کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔ کوئی ترقی نہیں ہو رہی ہے، کوئی بہتری نہیں ہو رہی اور ہم خاموشی سے کھڑے ہوئے ہیں، منجمد اور مردہ۔ یہ زیادہ دن تک نہیں چل سکتا۔ اب اسے اسی طرح چلنے دینا مناسب نہیں ہے۔ اسے تبدیل کرو۔ اس عادت کو چھوڑنے کے لئے مجمع کی ضرورت نہیں۔ اگر ایک شخص خود سوچنا سروع کر دے تو ارد گرد ہزاروں تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر تم سوچنا شروع کر دو تو اس تعویذ کو اتار پھینکو گے جسے نادانی میں باندھ رکھا ہے۔ اگر تم

سوچنا شروع کر دو تو اچھے لوگوں سے مندر کے متعلق گفتگو کر سکے گے۔ تم صرف اسی وقت پوچھو گے...... سوچنے سے سیکڑوں سوالات جنم لیں گے اور اگر سوالات اٹھائے گئے تو جوابات بھی مل جائیں گے۔ اگر جواب نہیں ملے گا تو تم غلط بات کو چھوڑ دو گے۔ اگر سوال مل گیا تو صحیح بات تمہارے ہاتھوں میں ہوگی۔

سوچنا مشکل عمل ہوتا ہے۔ سوچنا آسان نہیں ہوتا۔ نہ سوچنا انتہائی آسان ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارے متعلق سوچ رہا ہے تو ہمیں اس پر یقین کرنا ہے، ہمیں اور کچھ نہیں کرنا۔ ہماری عادت اپنا کام کرنے سے ہے، ہمارے متعلق دوسرے سوچیں...... ہم ان کے کام کرتے ہیں جو بہت پہلے زندہ تھے۔ کرشنا کے بعد کافی وقت گزر گیا۔ اسی بیچارے نے غور و فکر کیا ہوگا۔ ہم اسی کے خیالات کو لئے پھرتے ہیں۔ ہم گیتا کو پڑھتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے صوفی گیتا میں سوالات تلاش کرتے ہیں۔ اگر زندگی میں کوئی سوال اٹھے تو گیتا کھول کر اس میں دیکھتے ہیں۔ کیا کرشنا ہمارے متعلق ہر قسم کا غور و فکر کر چکا ہے؟ ہمارا کام یہ رہ گیا ہے کہ ہم مانگی ہوئی سوچ پر زندگی گزارتے رہیں؟ اگر ہم نے سوچنا شروع نہ کیا تو کرشنا کو اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے۔ گیتا سننے سے کرشنا پیدا نہیں ہوگا۔ صرف وہی لوگ جو جلدی اور صاف طور پر سوچتے ہیں جیسا کہ کرشنا خود کرتا تھا تب ہی ہمارے شعور میں کرشنا پیدا ہو سکے گا۔

میں تم سے اس امید میں یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں کہ شاید یہ مہمیز تمہارے شعور میں سوچنے کا عمل شروع کر سکے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری باتوں پر ایمان لے آؤ۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی باتوں پر ایمان لے آنا چاہئے وہ سوچ کے عمل کو پختگی نہیں بخشتے۔ بلکہ سوچ کی تمام جڑوں کو کاٹ رہے ہیں۔ ایسی گفتگو پر یقین نہ کرو۔ ہم زندگی بھر ایسے لوگوں کی باتوں پر یقین کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اب خود اپنے اندر تلاش کرو۔ زندگی میں ایک محکم فیصلہ کرو۔ اگر میرے اپنے خیالات نہیں ہیں تو میری زندگی بیکار گزر گئی۔ کم از کم مرنے سے پہلے ہمیں خود اپنے متعلق سوچنا چاہئے تاکہ ہم جب خدا کے حضور پیش کئے جائیں تو کہہ سکیں کہ ہم نے مقدور بھر یہ اور وہ سوچا۔ ہم اپنی سوچ کے مطابق ہی زندگی گزارتے ہیں۔ ہماری زندگی مانگی ہوئی نہیں ہے ورنہ جب ہم خدا کے حضور پیش ہوئے تو وہاں کوئی دوسری بات نہ ہوتی سوائے مانگی ہوئی زندگی کے۔

خدا تم سے پوچھتا۔ ''تمہاری اپنی کیا چیز ہے؟ کیا تم نے خود کچھ سوچا؟ کیا تم نے اپنی

زندگی گزاری۔ تم نے اپنا شعور کتنا اجاگر کیا؟"

پھر ہم جواب دیتے۔ "نہیں، ہم صرف گیتا اور رامانا پڑھتے رہے اور ہم پجاریوں پر یقین اور مہاتما کی باتوں کو مانتے رہے۔ ہمارے لئے سوچنا کیا ضروری ہے؟ ہمارے ملک میں بہت سے مہاتما ہیں۔ وہ ہمارا کام کر رہے ہیں۔"

خدا کہے گا کہ اس نے ان مہاتماؤں سے بھی سوال کیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ اپنے سے پہلے کے مہاتماؤں کا اتباع کرتے رہے۔

تم ہمیشہ کس نہ کسی کا اتباع کرتے رہے۔ تم نے خود کیوں کچھ نہیں سوچا؟ جو خود اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں سوچتے وہ اپنے ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ اپنی ذات کو پروان نہیں چڑھاتے۔ ایسے لوگ اپنی ذات نہیں ہو سکتے اور وہ لوگ جو اپنی ذات ہونے سے فرار حاصل کرتے ہیں، کیا وہ مذہبی ہو سکتے ہیں؟ وہ سچائی کو کس طرح جان سکے گا؟ وہ خدا کے گھر کیسے جائے گا؟ خدا کے معبد میں داخلے کی پہلی شرط فردِ واحد (Individual) ہونا ہے۔ تمہارے پاس اس کے یہاں لے جانے اور پیش کرنے کے لئے کوئی چیز ہونی چاہئے۔ خدا کہے گا دست بردار ہو جاؤ تو تمہارے پاس کوئی اپنی چیز ہونی چاہئے جسے حوالے کیا جائے۔

ہمارے پاس پیش کرنے کے لئے کیا ہے؟ تم خود سے اس سوال کو پوچھو۔ اندر تلاش کرو اور سوچو، شاید تمہیں سوال مل جائے۔ اس ملک میں اگر چند لوگ سوچنا شروع کر دیں تو انتہائی پرانی صورتِ حال ختم ہو سکتی ہے۔ ایک نئی روح جنم لے سکتی ہے۔ جمود ختم ہو کر شعور اجاگر ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر شاید ہم اس زمین پر اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ دوسرے لوگ پہلے ہی چاند پر قدم رکھ کر واپس آ چکے ہیں جبکہ ہمارے پیر اس زمین پر بھی لرز رہے ہیں کہ کہیں ہم گر نہ جائیں۔ اُدھر دوسرے لوگ چاند پر پیر جمائے کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارا کیا حال ہے؟ ہم اس زمین پر بھی کھڑے ہونے کے اہل نہیں۔ ہم ویسے نہیں ہیں۔ لیکن ہم چالاک ضرور ہیں۔ ہم اپنی حالت نہیں دیکھتے، اسی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اور دنیا کے ٹیچر ہونے پر بات کرتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم دنیا کے قائد ہیں۔ پوری دنیا ہماری رہنمائی چاہتی ہے۔ کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا ہے، ہر شخص خود اپنی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ پوری دنیا تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔ کسی کے پاس تمہاری طرف دیکھنے کا وقت ہی نہیں،

نہ ایسی حاجت ہے۔ کوئی شخص تمہارے علم کا انتظار نہیں کر رہا ہے۔

ہماری موجودہ صورت سے ظاہر ہے کہ ہم جہالت کی گہرائیوں میں دبے ہوئے ہیں۔ کون ہے جو علم کے لئے تمہارے پاس آئے گا؟ کیا تمہارے پاس ایسی کوئی اہلیت ہے کہ تم کسی کی رہنمائی کر سکو؟ کیا وہ لوگ جو روٹی کی بھیک مانگتے ہوں، کبھی کچھ دے سکتے ہیں؟ خود کو دھوکہ نہ دو۔ خود سے جھوٹ نہ بولو۔ اپنی حالت دیکھو اور سوچو۔

میں یہ سب کچھ نئی نسل سے کہہ رہا ہوں، نوجوان بچوں سے، جوانوں اور طالب علموں سے۔ اپنے والدین اور اساتذہ کی باتوں کا یقین نہ کرو۔ خود سوچو، غور کرو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں تو مان لو ورنہ جدوجہد کرو۔ صرف یقین نہ کرو۔

فرانس کی سوربورنی یونیورسٹی میں طالب علموں نے سامنے کی عمارت پر چند الفاظ لکھے۔ کوشش کی گئی کہ اسے مٹا دیا جائے۔ طالب علموں نے اس عجیب تحریر کو مٹانے سے انکار کر دیا۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ "پروفیسر صاحبان، تم بوڑھے ہو چکے ہو۔" تحریر واضح انداز میں لکھی ہوئی تھی جسے مٹانے کی کوشش کی گئی۔ پروفیسرز اور طلباء کے درمیان تکرار ہوئی لیکن طلباء نے کہا۔ "ہر پروفیسر کو گزر کے اس تحریر کو پڑھنا چاہئے کہ تم بوڑھے ہو چکے ہو اور انہیں برائے مہربانی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ وہ طلباء کو بوڑھا کرنے کا ارادہ نہیں کریں گے۔"

اس لئے، تھوڑا سا سوچئے......

میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے سکون سے مجھے سنا۔ بہت ہی محبت کے ساتھ آخر میں، میں خدا کے سامنے جھک رہا ہوں جو تم سب کے اندر موجود ہے۔ میرا اسلام قبول کر لو۔

ادراک کے ذریعے تبدیلی

سوال۔1

کیا تم نئی قسم کی تعلیم دینے کو ضروری سمجھتے ہو تا کہ لوگ فرق کو سمجھ سکیں؟ کیا معروضیت (Objectivity) اور موضوعیت (Sujecvtivity) علیحدہ ہو سکتے ہیں؛ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسی صحیح تعلیم دینا ممکن ہو سکتا؟

جی ہاں؛ یہ ضروری ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جو بچپن ہی سے امتیازات کی تعلیم نہ دے اور جو اس بات کو سمجھنے میں راہنمائی کرے کہ انفرادیت کیا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتداء میں بچوں کے اندر امتیازات نہیں ہوتے۔ امتیازات ہم پڑھاتے ہیں۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ہے کہ ایک بچہ خواب اور حقیقت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ایک بچہ رات میں دیکھے ہوئے خواب پر صبح کو روتا ہے۔ وہ اس کھلونے کے لئے روتا ہے جسے خواب میں دیکھا ہو۔ وہ اس کھلونے کو مانگتا ہے۔ بچہ اتنی اہلیت نہیں رکھتا کہ خواب میں دیکھی ہوئی چیز اور جاگنے کے بعد دیکھی ہوئی چیز کے فرق کو سمجھ سکے۔ اس کا دیکھنا بلا امتیاز ہوتا ہے۔ ایک شخص اپنے باپ کو ''فادر'' کہہ کے مخاطب کرتا ہے۔ ایک بچہ جب اس تخاطب کو سنتا ہے تو وہ بھی اسے ''فادر'' کہتا ہے۔ بچے کو یہ سمجھنے میں مشکلات پیش آتی ہیں کہ وہ شخص اس کا ''فادر'' نہیں ہے۔ وہ اس بات کو نہیں جانتا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان؛ وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ اپنی انفرادی دنیا میں رہتا ہے اور وہ انفرادیت کی تاریکی میں ہوتے ہیں۔

ایک برگزیدہ شخص اس انفرادیت کی دنیا میں داخل ہوتا ہے لیکن اس کی انفرادیت تاریکی میں نہیں ہوتی بلکہ منور اور تاباں ہوتی ہے۔ تاریکی اور جہالت کو تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن ایک برگزیدہ شخص کی انفرادیت کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی انفرادیت اس کے علم سے پیدا ہوتی ہے۔ بچے انفرادیت سے جنم لیتے ہیں لیکن انہیں امتیاز کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انہیں کسی حد تک امتیاز کی تعلیم دینا ضروری ہے؛ زندگی کے لئے وہ بھی کام کی چیز ہے۔ اس کو یہ پڑھانا ضروری ہے کہ زہر کیا ہے اور شہد کیا ہے۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ کہاں دروازہ ہے اور کہاں

دیوار ہے۔ اسے یقیناً پڑھانا چاہئے کہ کہاں خطرہ ہے اور کہاں حفاظت۔ اس قسم کی امتیازی باتیں پڑھانی چاہئیں۔

لیکن اس تعلیم کے پیچھے امتیاز کے ساتھ اس کے ذہن میں انفرادیت کا شعور بھی مسلسل بڑھتا رہنا چاہئے۔ مطلب یہ کہ اسے اس بات کا ادراک ہونا چاہئے کہ کبھی کبھی زہر بھی اسی طرح کام کرتا ہے جیسے شہد اور کبھی کبھی شہد بھی اسی طرح کام کرتا ہے جیسے زہر کرتا ہے۔ اس میں یہ سمجھنے کی اہلیت ہونی چاہئے کہ کبھی زہر سے بیمار آدمی شفا پا جاتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر شہد بہت زیادہ کھا لی جائے تو انسان مر بھی سکتا ہے۔ جب بچہ کسی قدر پروان چڑھ جائے تو اسے امتیازات کی تعلیم دی جانی چاہئے لیکن بچے کی آگہی بھی پروان چڑھنی چاہئے کہ تمام امتیازات عملی ضروریات کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ امتیازات آدمی کی حدود کو دیکھ کر بنائے گئے ہیں۔ اس کے اندر انفرادیت کا کرنٹ مسلسل دوڑتے رہنا چاہئے۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تمام چیزیں اس کے اندر موجود ہیں۔ بچے پر ہماری زندگی کا عکس اس طرح ہونا چاہئے کہ اسے اپنی انفرادی زندگی نظر آئے۔ اسے یہ نہیں محسوس ہونا چاہئے کہ معروضیت اور موضوعیت؛ دو الگ چیزیں ہیں...... اسے محسوس ہونا چاہئے کہ زندگی میں سب کچھ ہے۔ اسے جاننا چاہئے کہ وہ کھا رہا ہو یا عبادت کر رہا ہو؛ شخصیت وہی ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک طرح سے ان کی عبادت کا تعلق بھی کھانے سے ہے۔ اسے الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بچے کو اندرونی اصول کو جاننا چاہئے اور بچے کے لئے یہ مشکل نہیں ہے۔ جو حقیقتاً سمجھتا ہے کہ وہ وہی شخص ہے چاہے وہ کھا رہا ہو یا عبادت کر رہا ہو۔ لیکن وہ اس وقت الجھن میں پڑ جاتا ہے جب دیکھتا ہے کہ اس کا باپ کھاتے وقت ایک مختلف شخص ہو جاتا ہے؛ دوکان میں بیٹھتا ہو تو اور جبکہ عبادت کرتے ہوئے ایک تیسرا شخص؛ جب وہ گھر آتا ہے تو ایک مختلف شخص ہوتا ہے اور جب کسی ملازم سے ملتا ہے تو پھر کوئی الگ شخص۔ بچے میں اس بات کو سمجھنے کی اہلیت نہیں ہوتی۔

ایک بچے سے کہا جاتا ہے کہ اسے اپنے باپ کی عزت کرنی چاہئے کیونکہ وہ بوڑھا ہے۔ پھر بچہ ملازم کی بھی عزت کرنا چاہتا ہے کہ کیونکہ وہ بوڑھا ہے کیونکہ بوڑھے لوگوں کی عزت کی جانی چاہئے؛ بچوں کا یہ رویہ سمجھ سے باہر ہے۔ ہم پھر بچے سے کہتے ہیں کہ اپنے بوڑھے والد کی عزت کرو لیکن بوڑھے ملازم کی نہیں۔ اس طرح ہم امتیاز پیدا کرتے ہیں۔

لیکن یہ امتیاز صرف ایک باپ اور ملازم کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ اس کا دو چہرہ بنا دیتا ہے۔ ایک چہرہ والد کو دکھاتا ہے اور دوسرا ملازم کو۔ اس طرح بچہ یہ سیکھتا ہے کہ وہ جب مندر میں ہو تو ایک طرح سے کھڑا ہو اور جب دوکان میں بیٹھے تو دوسری طرح سے۔ ایک شخص کو دوکان میں چالاک ہونا چاہئے اور عبادت گاہ میں سادگی کے ساتھ۔ ہم اس طرح تقسیم اور تفریق کی تعلیم دیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ تقسیم اور تفریق تہہ در تہہ جمع ہو کر بچے کو زندگی میں امتیاز کا حامل بنا دیتی ہے۔

جو سچ پوچھو تو تعلیم بچپن سے ہی' یعنی والدین' اسکول اور یونیورسٹی تک ایسی ہونی چاہئے کہ بچے کو اس حقیقت کا ادراک ہوتا رہے کہ ہر چیز باہم مربوط ہوتی ہے۔ اس کو جاننا چاہئے کہ چاہے دو چیزیں ہی کیوں نہ ہوں' وہ ایک کڑی سے جڑی ہوتی ہیں۔ اس کے ذہن میں ایک چیز صاف ہونی چاہئے کہ غیر منقسم اور ایک شخصیت ہے اور یہ کہ دو چیزیں نہیں ہو سکتیں جیسے اندر اور باہر۔ اندر سے بھی میں ہوں اور باہر سے بھی میں ہی ہوں یعنی ایک۔ اس طرح اس میں ایک مکمل اور مربوط شخصیت پیدا ہوگی' ایک ایسی شخصیت جو غیر منقسم ہوگی۔

ہماری سوسائٹی کا سسٹم کچھ ایسا ہے جو شخصیت کی تعمیر تو کرتا ہے لیکن اس میں انفرادیت نہیں پیدا ہوتی۔ سوسائٹی شخصیت پیدا کرتی ہے لیکن انفرادیت کی حامل شخصیت نہیں پیدا کرتی۔ شخصیت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک انفرادیت کا حامل شخص ہے بلکہ ایک ایسا شخص ہے جو کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ باہر سے اس کے پاس کئی ماسک (چہرے) ہوتے ہیں۔ ایک ماسک کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف شخصیت ہے۔ وہ ضرورت کے مطابق ماسک تبدیل کر لے گا۔ اس کے اندر کوئی انفرادی یا نمایاں شخصیت نہیں ہے جو ہر حال میں ایک جیسی ہوتی ہے چاہے کوئی بھی صورتِ حال ہو۔ جیسا وہ اندر سے ہے ویسا ہی باہر سے' جیسا وہ عبادت گاہ میں ہے ویسا ہی دوکان پر۔ ہم ہمیشہ یہی کرتے ہیں۔ ہم ارادہ کرتے ہیں' منزل کا تعین کرتے ہیں اور اختتام کر دیتے ہیں' یہ بنیادی ضرورت ہوتی۔ اس سے انسان بہت سی مشکلات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ منزل یا ہدف ہمیشہ مستقبل میں ہوتا ہے جبکہ ہم زمانۂ حال میں ہیں۔ جب ہم زمانۂ حال میں ہوں گے تو ہمارا ہدف اور منزل ہمیشہ مستقبل میں ہوگی ہدف یا منزل کبھی زمانۂ حال میں نہیں ہو سکتی۔ ہم مستقبل میں نہیں ہو سکتے۔ جب ہم زمانۂ حال میں

ہیں تو مستقبل میں نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہم ذہن میں کھنچاؤ پیدا کرتے ہیں جس کا کوئی حل نہیں۔ اس طرح ایک آدمی میں ہم جو بے چینی پیدا کرتے ہیں اسے نہیں ختم کیا جا سکتا۔ ہم آج ہیں اور ہمارا ہدف مستقبل میں ہے۔ آج اور کل' دونوں کبھی نہیں مل سکتے کیونکہ کل جب آتا ہے تو وہ آج ہو جاتا ہے اور ہدف کل کے لئے منتقل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں آدمی پوری زندگی تبدیل نہیں ہو پاتا اور اس کی سوچ کا ہدف اسے تکلیف دیتا اور پریشان کرتا رہتا ہے' اگر ایک آدمی پرتشدد ہے تو یہ پرتشدد رہے گا لیکن ہدف پرتشدد نہیں ہوگا۔ وہ کہے گا کہ میں کبھی غیر تشدد پسند بھی ہو جاتا ہوں' اگر اس زندگی میں نہیں تو دوسرے جنم میں ہو جاؤں گا۔ لیکن اس کا پرتشدد رجحان جاری رہے گا کیونکہ اس کی زندگی تو آج ہے اور پرامن رجحان کل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ پرامن رجحان جو کل آنے والا تھا وہ اسی طرح کل تک کے لئے منتقل ہو جائے گا۔ اسی طرح وہ آگے بڑھتا جائے گا۔

منزل یا ہدف میں ایک حسن بھی ہے کہ آدمی زندگی میں اس کام کو ملتوی کرنے کی ٹرک سوچے گا اور کہے گا۔ "آج پرامن ہونا ممکن نہیں' میں اس وقت تو پرتشدد ہوں لیکن آہستہ آہستہ کوشش کروں گا' مراقبہ کروں گا' دعا کروں گا' یوگا کروں گا اور سنیاس لوں گا۔ اگر اس زندگی میں نہیں تو دوسرے جنم میں یا اس کے بعد کے جنم میں' کسی کسی نہ کسی وقت پرامن ہو جاؤں گا۔ یہ اتنی آسان بات نہیں ہے کہ آج ہی ہو جائے۔"

اس لئے کل تک ملتوی کرنے کا ایک آسان طریقہ ہاتھ آئے گا اور جب ہدف کل تک کے لئے ملتوی ہو جائے گا اور ہم ویسے ہی رہ جائیں گے جیسے کہ آج ہیں تو کہیں گے اس میں میری کوئی غلطی نہیں۔ ہدف آج حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ میں ویسا ہی پرتشدد رہوں گا جیسا کہ آج ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک شخص جو پرتشدد ہے ویسا ہی رہے گا۔ پرامنی ہدف ہوگی اور وہ عبادت گاہ میں جا کر یہ الفاظ کہے گا۔ "عدم تشدد سب سے بڑا مذہب ہے۔ یہی واحد مذہب ہے جسے اپنانا چاہئے۔"

ہمارے پرانے TIRTHANKARAS نے ماضی میں اسے اپنایا تھا۔ اب تمہیں اسے اپنانا ہے۔ یہ مہاویرا کی کہانی میں لکھا ہوا ہے۔ اس نے عدم تشدد کو کئی جنموں بعد اپنایا تھا۔ عدم تشدد مستقبل کا ہدف ہے۔ "لیکن اس وقت میں پرتشدد ہوں۔" میں جس بات پر زور دے

رہاہوں وہ یہ ہے کہ ہدف سے چیزیں آئندہ پر موقوف ہوجاتی ہیں اور یہ انتہائی خطرناک ہے۔

دوسری چیز یہ کہ ہدف کے نتیجے میں آدمی کے ذہن میں استیصال (بیخ کنی) پیدا ہوتا ہے اور پرتشدد ہونے کی وجہ سے آدمی کو اذیت ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ عدم تشدد کا حامل ہوجائے......لیکن، وہ کر کیا سکتا ہے؟ کیا وہ تشدد کو دبا دے۔ کیا وہ یہ ظاہر کرے کہ وہ عدم تشدد کا حامل ہے۔ کیا راستہ ہوسکتا ہے؟ چونکہ میں پرتشدد ہوں' اس کے باوجود میں عدم تشدد کا حامل ظاہر کرتا ہوں' میرا تشدد پسند روجہ جاری رہتا ہے۔ اس لئے یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ میں عدم تشدد کا حامی ہونے کے باوجود تشدد کروں گا۔ اگر مجھے عدم تشدد کا حامل بننا ہے تو میں اپنی بیوی سے الگ ہوجاؤں گا۔ مجھے اس سے سروکار نہیں ہوگا کہ وہ میرے عمل کے نتیجے میں بھوکی مرجاتی ہے اور بچے سڑکوں پر بھیک مانگتے ہیں اور یہ اس دوران ہوگا جب میں عدم تشدد کے عمل سے گزر رہا ہوں گا۔ یہ ستم ظریفی اس وقت ہوگی جب میرا یہ پرتشدد رویہ' صرف اس لئے ہوگا کہ میں نے اپنا ہدف عدم تشدد کے لئے مقرر کیا ہے چنانچہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

جین مت کے ایک مشہور سادھو تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو قصبے میں چھوڑا اور بیس برسوں تک بنارس میں رہے۔ انہیں ٹیلی گرام کے ذریعے بیوی کے مرنے کی اطلاع ملی۔ تار پڑھنے کے بعد انہوں نے بلند آواز میں کہا۔ ''بہت اچھا' چلو جان چھوٹی۔'' ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وہ ایسے بڑے درویش تھے کہ اپنی بیوی کی موت پر بھی کسی رنج کا اظہار نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا۔ ''بہت اچھا' چلو جان چھوٹی۔''

کسی نے مجھے ان کی سوانح عمری لاکر دی تھی۔ میں نے اس شخص سے کہا کہ میاں۔ ''میرے لئے یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ جب وہ بیس سال پہلے اپنی بیوی کو چھوڑ کر گیا تو پھر کسی رنج و ملال کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ اسے رنج ہونا ہی نہیں چاہئے تھا۔ وہ تو اسے بیس برس پہلے ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ایسی بیوی کے لئے جو چھوڑ دی گئی تھی رنج کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کی موت پر' اگر اس درویش نے سوچا کہ اس کی بیوی ایک مصیبت تھی تو اس کا مطلب ہوا کہ وہ بیس سال تک اس کی موت کا انتظار کرتا رہا تھا۔ یہ ایک پرتشدد آدمی تھا' جو اسے قتل بھی کرسکتا تھا۔ جو سچ پوچھو تو اس کو مرتا چھوڑ کر دور بھاگ جانا قتل کی کوشش ہی تو تھی......اور اب بیس سال بعد اس نے جان چھوٹ جانے کی بات کی۔ وہ شخص بہت ہی متشدد ذہنیت کا مالک تھا یہاں تک کہ اس

کے دل میں' اس کی موت پر بھی ترحم کے جذبات نہیں پیدا ہوئے۔ اس نے جو کچھ کہا وہ بھی مکمل طور پر تشدد ہی تھا اور ان بیس برسوں کے دوران اس نے کچھ اور نہیں کیا بلکہ تشدد کی مشق ہی کرتا رہا تھا۔ ایک پرتشدد شخص عدم تشدد کی کوششوں میں اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ وہ دوسروں کے لئے متشدد ہونے کے ساتھ خود اپنے لئے بھی متشدد تھا۔ دوسروں کے ساتھ پرتشدد ہونے کے یہ مسائل ہیں۔ ہم خود اس بات کو جانتے ہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی کہ ہم متشدد ہیں لیکن ہم جب اپنے ساتھ تشدد کرتے ہیں تو یہ بھی نہیں سمجھ پاتے کہ ہم پرتشدد ہیں۔ اگر کوئی شخص تیزی سے جا رہا ہو تو ہم یہ نہیں سمجھتے کہ وہ کسی تشدد کا ارتکاب کررہا ہے۔ لیکن جب ہم کسی شخص کو پکڑ کر اسے ایک کمرے میں بند کردیتے ہیں' کھانا پانی نہیں دیتے' کئی دنوں تک بھوکا رکھتے ہیں تو پورا شہر آ کے کہتا ہے کہ میں بہت ہی تشدد پسند ہوں کہ ایک آدمی کو اتنے دنوں تک بھوکا بند کئے رکھا۔ لیکن اگر میں خود کو ایک کمرے میں بند کرلوں اور بیس دنوں تک کچھ نہ کھاؤں تو لوگ مجھے متبرک اور عظیم درویش سمجھیں گے۔ حالانکہ ان دونوں صورتوں میں' میں ایک ہی قسم کا عمل کرتا رہا ہوں۔ صرف ایک فرق ہے کہ پہلی صورت میں' میں کسی اور کے لئے متشدد تھا جبکہ دوسری صورت میں خود اپنے لئے۔ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ ایک کیس میں کرنے والا' اور وہ دوسرا شخص جس کے ساتھ کچھ کیا گیا ہے' وہ دونوں مختلف لوگ نہیں ہیں۔

میں تمہیں ایک دوسری بات بتاؤں کہ ایک پرتشدد شخص کچھ بھی کرلے وہ پرامن نہیں بن سکتا' وہ متشدد ہی ہوگا۔ وہ اس طرح پرامن نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ سوال یہ نہیں کہ عدم تشدد ایک بڑا مذہب ہے لیکن یہ کہ تم کون ہو اور کیا کررہے ہو۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھو۔ اگر میں تشدد کررہا ہوں تو میرے اندر دیکھو کہ میں متشدد ہوں تو میری فطرت کو ادراک کے اندر تک جانے دو اور مجھے تسلیم کرنے دو کہ میں صبح سے شام تک متشدد رہتا ہوں۔ مجھے یہ یقین ہونے دو کہ جب میں سڑک پر چل رہا ہوتا ہوں تو بھی میری چال میں تشدد ہوتا ہے۔ تشدد وہی نہیں ہے جب ایک شخص چاقو کو کسی شخص کے جسم میں اتار دے۔

کم سمجھ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کسی کے سینے میں چاقو اتار دے تو ہی تشدد ہوا۔ کسی شخص کے ساتھ تشدد کا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے تو سینے میں چاقو اتارنے سے زیادہ پرتشدد ہوتا ہے۔ تشدد تو اس وقت بھی ہوتا ہے جب تم کسی کو دیکھ بھی نہ رہے ہو۔ یہ سوال نہیں کہ پرتشدد

انداز میں دیکھا جائے۔ اگر تم سڑک پر چل رہے ہو میں وہیں سے گزرتے ہوئے تم پر نگاہیں ڈالے بغیر گزر جاؤں جیسے کہ تم انتہائی غیر اہم شخص ہو انتہائی معمولی...... بڑے لیڈر سڑک پر اسی طرح چلتے ہیں۔ وہ اس طرح چلتے ہیں جیسے سڑک پر چلتے ہوئے لوگ کیڑے مکوڑے ہیں۔

سوال۔2

کیا تم سمجھتے ہو کہ ہماری نئی تعلیم اور تعلیمی ادارے کبھی اس بات کے اہل ہو سکتے ہیں کہ وہ اس مسئلے کو حل کریں؟

سب سے پہلے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ بات اہم ہے کہ تم اس کا ادراک کرو کہ تشدد ہوتا کیا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ عدم تشدد حاصل کیا جائے۔ ایک شخص کو سمجھنا چاہئے کہ وہ اس وقت کیا ہے یعنی آج' اس لمحے۔ اگر مجھے نظر آئے کہ میں پورے چوبیس گھنٹے' متشدد رہتا ہوں...... ایسا نہیں کہ تم کبھی متشدد ہوتے ہو اور کبھی نہیں ہوتے۔ تمہاری شخصیت میں ایک تسلسل ہے۔ تم جیسے بھی ہو تقریباً چوبیس گھنٹوں تک رہتے ہو' کبھی کچھ تھوڑا کم پر تشدد اور کبھی کچھ زیادہ پر تشدد۔ کسی وقت تشدد ظاہر ہو رہا ہے' کبھی تشدد نے روپ بدل لیا ہے۔ کچھ بھی ہو تم اس طرح رہو گے۔ ایک متشدد شخص کا تشدد اس کے ہر عمل میں ہوتا ہے۔ چاہے وہ عبادت کیوں نہ کر رہا ہو' اگر تم اس کے دل میں جھانک کر دیکھو گے تو پاؤ گے کہ وہ متشدد ہے۔ اس وقت بھی جب کسی کی مدد کر رہا ہو۔ اگر تم اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھو تو وہ تشدد ہی کر رہا ہوگا۔ جب وہ خیرات کر رہا ہو تو کسی کی غربت اس کے پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ یہ اہمیت ہوتی ہے کہ وہ خیرات کر رہا ہے۔ جب وہ کسی کی مدد کر رہا ہو تو اس لئے کہ وہ یہ کام کر رہا ہے اور وہ بہت اہم شخص ہے' وہ نہیں جو اس امداد کو وصول رہا ہے۔ خیرات کرتے ہوئے بھی اس کی انا کو تقویت ملتی ہے۔ ایک متشدد آدمی جو بھی عمل کرے گا اس میں تشدد ہوگا۔

اس لئے میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ عدم تشدد کو ہدف بنانا ضروری نہیں۔ یہ ایک پرانی چال ہے جو فیل ہو چکی ہے۔ اس نے بڑا نقصان پہنچایا۔ ضروری بات یہ ہے کہ یہ جانا جائے کہ میں کون ہوں۔ اسے جانو اور تسلیم کرو۔ میں آج کیا ہوں؟ میں اس وقت کیا ہوں؟ اگر میں نے صحیح طور پر جان لیا تو کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے تشدد کو جتنا صاف طور پر دیکھوں گا تو اسے گہرائی تک سمجھ لوں گا۔

جس وقت میں تشدد کو بحیثیت تشدد دیکھوں گا تو تشدد ناممکن ہو جائے گا۔ تشدد غائب ہو جائے گا۔ میرا بیٹھنا' کھڑا ہونا' کھانا' پینا' چلنا' گفتگو کرنا' ملاقات کرنا...... غرض تمام حرکات وسکنات تبدیل ہو جائیں گی۔ ہمیں تبدیل نہیں کرنی ہوگی۔ اگر عدم تشدد کا ہدف ہمارے سامنے ہو تو ہم کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا اور تسلیم کرنا ہے کہ کہ میرے اندر تشدد ہے اور پھر تبدیلی شروع ہو جائے گی۔ یہ تو صرف آگاہی ہے جو تبدیلی لاتی ہے۔ جیسے ہی تبدیلی شروع ہوگی ہمارا متشدد رویہ غائب ہو جائے گا۔ جب تشدد غائب ہوتا ہے تو جو کچھ بچتا ہے وہی عدم تشدد ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ عدم تشدد ہدف نہیں ہے جس تک آج پہنچا جائے۔ اگر آج میرے ذہن سے تشدد ختم ہو جائے تو پھر آج ہی عدم تشدد حاصل ہو گیا۔ اس لمحے عدم تشدد نہ تو کہیں سے لایا جا سکتا ہے اور نہ اس تک پہنچا جا سکتا ہے۔ عدم تشدد کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں کہ میں دس سال یا اس کے بعد یا دسویں جنم میں اس تک پہنچ جاؤں گا۔ یہ کوئی ہدف یا منزل نہیں ہے۔ اگر میرا تشدد آج ختم ہو جاتا ہے تو آج ہی عدم تشدد حاصل ہو جائے گا۔ یہ تشدد کیسے غائب ہوگا؟ یہ کسی قسم کے تشدد کے ذریعے نہیں جائے گا۔ اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ برت (روزہ) رکھنے سے عدم تشدد مل جائے گا...... برت خود ایک متشدد رویہ ہے۔ ایک اذیت اور خودکشی جیسا عمل ہے۔ روزہ رکھنے سے نہ تو تشدد ختم ہو سکتا ہے اور نہ عدم تشدد کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ''اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ سر کے بل کھڑا رہے گا یا کانٹوں کے بستر پر سوئے گا۔'' یہ سب تشدد کے طریقے ہیں۔ ان کے ذریعے کوئی عدم تشدد نہیں پا سکتا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدم تشدد کے جذبات کیسے پیدا کئے جائیں؟

پہلی بات: اسے سمجھنا پہلا طریقہ ہے۔ اس دنیا میں عدم تشدد کے جذبات پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ اسے سمجھا جائے...... کیونکہ جس میں شعور و آگہی پیدا ہوتی ہے وہ کبھی متشدد نہیں ہوتا۔ شعور اور سمجھداری میں اتنا عدم تشدد ہوتا ہے کہ تشدد ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ایک بار جب تم میں یہ دیکھنے کی اہلیت ہو جائے کہ یہ تشدد ہے تو وہ غائب ہو جاتا ہے۔ تمہارے دیکھنے کے اس لمحے میں وہ غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تم نے دوسرا سوال موجودہ تعلیمی نظام پر کیا ہے...... کیا یہ اس بات کا اہل ہے کہ کچھ کر سکے۔

موجودہ تعلیمی نظام کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ آج کی تعلیم کا پورا سسٹم ذہن میں ہدف اور منزل کا تعین کر کے بنایا گیا ہے۔ ہم بچوں کو ہدف سر کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہم بچوں کو پڑھاتے ہیں کہ چوری نہ کرو۔ چوری نہ کرنا ہدف ہے۔ یہ ہدف کہیں مستقبل میں ہے۔ بچے آج چوری کر رہے ہیں۔ ٹیچر آج چوری کر رہے ہیں۔ باپ چوری کر رہا ہے۔ ماں بھی چوری کر رہی ہے۔ شہر چوری کر رہا ہے۔ پوری دنیا چوری کر رہی ہے اور ہر شخص یہ پڑھا رہا ہے کہ چوری نہ کرو۔ چوری چھوڑ دو۔ بچہ بھی عہد کرتا ہے چوری ترک کر دے گا۔ لیکن اس لمحے جب یہ عہد کیا جا رہا ہے...... اس وقت تو چوری قابلِ قبول ہے۔ چوری جاری رہے گی۔ کیونکہ بچہ کہتا ہے کہ وہ چوری چھوڑ دے گا۔ کل کے متعلق وعدہ جھوٹا ہو جاتا ہے۔ آج کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ آج تو چوری کی جا رہی ہے۔ کی جاتی رہے گی۔ لیکن اسے بہر حال چھوڑنا ہے' یہی آدمی کا ہدف ہے آدمی کی زندگی میں ہدف پر گفتگو کرنا بہت ہی بُری چیز ہے۔

اس وقت ہمیں تعلیم کا ایسا سسٹم چاہئے جس میں ایک بچے سے کہا جائے کہ جھوٹ نہ بولا کرو لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جائے کہ وہ غور کرے کہ کب جھوٹ بول رہا ہے۔ ڈرنے اور فرار حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف یہ جانو کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ جیسے ہی بچے کو اس بات سے آگاہی ہوئی۔ تمہاری مدد سے' کہ کب جھوٹ بو رہا ہے' یہی کافی ہے۔ ہمیں کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں یہ نہیں کہنا کہ جھوٹ نہ بولو یا اسے چھوڑ دو۔ یہ سوال پیدا نہیں ہوگا۔ اس کا احساس اتنا بڑھنا چاہئے کہ وہ اسی لمحے سمجھ لے کہ جھوٹ بولا ہے۔ لیکن ہماری زندگی میں یہ ہو رہا ہے۔ آدمی میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ چیزوں کو سمجھ سکے۔

تم سڑک سے گزرتے ہوئے آدمی سے پوچھو کہ وہ کیسا ہے؟ اس کے بعد اس سے سوال کرو کہ آیا تم نے خاص قسم کے آدمی کو دیکھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے گزشتہ کل دیکھا تھا۔ جبکہ خاص آدمی اس دن شہر میں تھا ہی نہیں۔ جواب دینے والے شخص کا اس خاص آدمی سے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اسے جھوٹ بولنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے شاید یہ بات نہیں معلوم تھی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا یا یہ کہ وہ کیوں گفتگو کر رہا تھا۔ لیکن کوئی وجہ تو ہونی چاہئے کہ وہ کیوں بات کر رہا تھا۔ وہ نہ تو اس بات سے آگاہ تھا کہ وجوہات کیا تھیں۔ نہ اس کے متعلق کوئی تصور تھا۔

میرے ایک پروفیسر تھے میں جب بھی کسی کتاب کے متعلق بات کرتا' وہ فوراً جواب دیتا۔ ''اوہ'' یہ بہت اچھی کتاب ہے۔ میں نے اس کتاب کو پڑھ رکھا ہے۔'' چند دنوں بعد مجھے شبہ ہونے لگا کیونکہ اگر اس نے کتاب پڑھ رکھی تھی تو کبھی کلاس میں اس کا ذکر کیوں نہ کیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایسی کوئی بھی کتاب نہیں جسے اس نے نہ پڑھی ہو۔

ایک دن جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے ایک فرضی رائٹر کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ ایک روسی فلاسفر جس کا نام بوموکو تھا...... اس نے کہا۔'' ہاں ہاں۔ اس کی کتاب بہت ہی اچھی ہے۔ میں نے اس کی کتاب پڑھی ہے۔ لیکن اسے پڑھے ہوئے بیس برس بیت چکے ہیں۔

پھر میں نے فوراً ہی کہا کہ ایسا کوئی مصنف نہ تو بیس برس قبل تھا اور نہ بیس کروڑ برس قبل۔ جب کوئی مصنف نہ ہو تو اس کے کتاب لکھنے کا کیا سوال ہے۔'' میں نے سوال صرف اس لئے کیا تھا کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں تم نے ایک خاص کتاب نہیں پڑھی۔ لیکن تم نے سادگی سے کہہ دیا کہ پڑھی ہے۔ تمہارے لئے یہ تسلیم کرنا تکلیف دہ تھا کہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہو سکتی جسے تم نے نہ پڑھا ہو۔''

یہی انا ہے جو مسائل کو جنم دیتا ہے۔ لیکن وہ اس بات سے آگاہ نہیں تھا۔ وہ اس طرح کی باتیں کرنے کا عادی تھا اور یہ اس کی فطرت بن چکی تھی' اس کے خون میں رچ بسی۔ اس سے جھوٹ برآمد ہوتا تھا۔

چنانچہ کسی کو یہ پڑھانے کی ضرورت نہیں کہ جھوٹ نہ بولو۔ اسے بیدار کرنا ہے تا کہ جب وہ جھوٹ بولے تو اسے احساس ہو کہ اس نے جھوٹ کہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آہستہ آہستہ جھوٹ بولنا ناممکن ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ اس خرافات اور بے وقوفی کو تسلیم کر لے گا اور اس کے نقصانات کا بھی احساس ہو جائے گا۔ ایک شخص یہ بھی تسلیم کرے گا ایک جھوٹ سے دوسرا اور تیسرا بھی جنم لے گا اور بالآخر اس میں ایسا پھنسے گا کہ نکلنا مشکل ہو جائے گا۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جھوٹ بولنے سے دوسرے کو تکلیف پہنچنے سے زیادہ خود اسے پہنچتی ہے لیکن ہم خود کو بہت زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں کیونکہ آہستہ آہستہ ہم حقیقت جاننے سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ انسانیت کی رو سے' میں سمجھتا ہوں' ایسے لوگ کمزور ہو کر مٹی کے

مادھو ہوجاتے ہیں جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جھوٹ بولنے والا کسی کی بات کا یقین نہیں کرتا کہ کوئی بھی کبھی سچ بولتا ہے۔ وہ کسی پر یقین نہیں کرتا۔ وہ کسی کو دوست بھی نہیں بنا پاتا۔ وہ کسی بھی کام کو حقیقی انداز میں نہیں کر پاتا۔ آدمی ہونے کے ناطے اس کی صلاحیت کمزور ہوجائے گی۔ اگر ہم سمجھ لیں کہ ہماری جھوٹ بولنے کی عادت ہمیں کہاں لے جاتی ہے اور ہمارے اندر کیا ہورہا ہے یا ہمیں اس کا کیا پھل ملتا ہے یا ہم دوسروں کے ساتھ کیا کررہے ہیں تو پھر ہم مزید جھوٹ نہیں بولیں گے۔

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم یہ تو پڑھاتے ہیں کہ کسی کو کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہئے لیکن یہ کبھی نہیں پڑھاتے کہ کوئی جھوٹ بولتا کیوں ہے۔ ایک طرف تو انہیں پڑھاتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولو دوسری طرف وہ ہوتا ہے جس کی بناء پر وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ مثال کے طور پر جھوٹ بولنے کی بنیادی وجہ خوف ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ غلط بیانیاں نہیں ہونی چاہئے تو ہمیں خوف کو ختم کرنا ہوگا۔ لیکن استاد کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہوتی ہے جس سے وہ دھمکاتے رہتے ہیں کہ کسی نے جھوٹ بولا تو اس کا سر توڑ دوں گا۔ ٹیچر کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کررہا ہے۔ ایک طرف تو وہ بچے کے ذہن میں خوف بھرتا رہتا ہے دوسری طرف سر توڑنے کی دھمکی دیتا ہے۔ یہی خوف بچے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ جھوٹ بولے۔ اگر بچہ کسی دوسرے کے ساتھ کھیل رہا ہو اور تاخیر سے اسکول پہنچے وہاں اگر وہ کہے گا کہ وہ باپ کی دوا لینے گیا ہوا تھا اس لئے دیر ہوئی۔ اس کے ایسے کہنے کی وجہ چھڑی کا خوف ہے۔ ٹیچر کہتا ہے کہ اگر کسی بچے نے جھوٹ بولا تو اسے سزا ملے گی۔ ٹیچر یہ نہیں سمجھتا کہ اگر جھوت بولنا غلط ہے تو چھڑی سے دھمکی دینا بھی غلط ہے۔

اگر ٹیچر چاہتا ہے کہ اس کے طلباء جھوٹ نہ بولا کریں تو خوف کو تعلیمی میدان سے نکالنا ہوگا۔ بچوں کو بے خوف بننے دو۔ ان میں ہمت اور حوصلہ بھر دو تا کہ وہ کسی بھی مشکل سے ہنستے ہوئے مقابلہ کرسکیں۔

میں نے ایک ناول پڑھی۔ یہ ایک منفرد کہانی تھی۔ اس میں ایک کردار ایسا تھا جس نے ایک قطعی اجنبی شخص کو یکا یک چاقو سے قتل کردیا۔ دو آدمی ساحل پر غسل آفتابی کررہے تھے یکا یک ایک شخص اٹھا اور دوسرے کی پشت میں چھرا گھونپ دیا۔ اس نے مقتول کا چہرہ تک نہیں

دیکھا۔ کیونکہ اجنبی شخص پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ جب اسے کورٹ میں پیش کیا گیا تو اس نے وضاحت کی کہ وہ یہ محسوس کررہا تھا کہ اس نے پوری زندگی کچھ نہیں کیا۔ اس کی پوری زندگی یونہی گزری۔ اس کا نام کبھی اخبارات میں نہیں چھپا۔ چنانچہ وہ جب سن باتھ لے رہا تھا اور اس کی پیٹھ چمک رہی تھی تو اس نے اس میں چھرا گھونپ دیا اس طرح اس کا نام اخبارات میں چھپ جائے گا اور لوگ اس پر گفتگو کریں گے۔ اس نے کہا "اس لئے میں نے ایسا کردیا۔ میں بھی خوشی سی محسوس کررہا ہوں اور میں نے اسے اسی خوشی کے لئے قتل کیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری کوئی وجہ نہیں۔"

کہانی پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ کورٹ کو بھی یقین نہیں آیا کیوں کہ اس دنیا میں ایسا کسی نے بھی کبھی نہیں کیا۔ اس لئے کورٹ نے دھمکی دی کہ وہ اس کی بہت بڑی سزا دے گا۔ اس شخص نے جواب دیا۔ "کہانی بس یہی ہے کچھ اور نہیں۔ کورٹ جو مناسب سمجھتی ہے کرے۔"

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی گواہی ہو کیونکہ کوئی بھی اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ کسی کو کسی وجہ کے بغیر قتل کردیا جائے گا۔

ایک گواہ نے کہا کہ جب اس کی ماں مری تھی وہ ایک تھیٹر میں موجود تھا۔ اس کی ماں صبح کے وقت مرگئی اور اسی رات وہ تھیٹر میں ایک فلم دیکھ رہا تھا۔ کورٹ نے پوچھا کہ کیا وہ اسی رات تھیٹر گیا تھا جس دن اس کی ماں مری تھی۔ تو اس نے جواب دیا۔ "ہاں۔ میں فلم دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میری ماں تو پہلے ہی مرچکی ہے اور میں اگر تھیٹر گیا تھا تو یہ ماں کے مرنے کے بعد ہی جاسکتا ہوں۔ میرے تھیٹر جانے کا واقعہ اس کی موت کے بعد کا ہے۔ چاہے یہ ایک دن بعد یا دو دن بعد یا تین دن بعد بھی ہوسکتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر لوگ ماں کے مرنے سے پہلے تھیٹر جاتے ہوں تو تمام تھیٹرز کو بند کردینا چاہئے۔ کسی کی ماں ہے جو نہیں مرتی؟ ہر شخص کی ماں کسی نہ کسی دن مرتی ہے۔"

کورٹ نے سوچا کہ یہ آدمی تو بہت خطرناک ہے۔ وہ اسی رات شو دیکھنے گیا تھا جس دن اس کی ماں مری تھی۔ اس نے مزید وضاحت کی کہ اس نے تھیٹر کا ٹکٹ پہلے ہی لے رکھا تھا' اس کی موت سے پہلے۔ اس کے باوجود کورٹ نے سوچا کہ۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ اسی رات شو دیکھا

جائے؟'' وہ شخص بحث کرتا رہا۔ اس کی موت کے بعد ہی شو دیکھا گیا۔ اس شخص نے شو دیکھنے سے انکار نہیں کیا۔

دوسرے شخص نے اس سے پوچھا۔ ''تم اپنی ماں کے مرنے کے بعد بہت غمگین ہو گے؟ اس شخص نے کورٹ کے سامنے ثبوط پیش کیا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہاں۔ مجھے سخت افسوس تھا۔ گزشتہ رات میں اس کے بستر مرگ کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور رات بھر سو نہیں سکا تھا۔''

کورٹ کو بھی بتایا گیا کہ یہ آدمی اس لئے بھی انتہائی خطرناک ہے کیونکہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا۔ ''شروع میں تو میں اس کی موت کی وجہ سے افسوس میں رہا۔ اس کے بعد میرا افسوس مزید بڑھ گیا کیونکہ میں رات بھر سو نہیں سکا تھا۔ میری ماں تو مر چکی تھی۔ اب میں کہاں تک افسوس کرتا۔ کیا میں اپنی دوسری رات بھی تباہ کر لیتا؟''

کورٹ کے لئے یہ قابل قبول نہیں تھا۔ کورٹ کا مجسٹریٹ سوچنے لگا کہ کم از کم اسے، جو بھی اس نے کہا صحیح صحیح نہیں بتانا چاہئے تھا۔ اس نے بے وقوفوں کی طرح بات کی۔ اس نے صحیح واقعات کو اس طرح بیان کیا جسے دنیا کا کوئی شخص تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ پوری دنیا جھوٹ کے سہارے قائم ہے۔

مجسٹریٹ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا۔ ''میں نے اس سے پہلے اس جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ وہ کہتا رہا کہ اسے پہلے اپنی ماں کے مرنے کا دکھ تھا لیکن چند گھنٹوں بعد یہ سوچا کہ اسے ماں کی موت کے بعد پوری رات نہیں تباہ کرنی چاہئے۔ اس نے جو کچھ بھی کہا وہ سچ تھا۔ میں اس بارے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

حقیقت یہ ہے کہ ہم پہلے یہ پڑھاتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ساتھ آدمی کے دماغ میں خوف بھی بھرتے جاتے ہیں کہ جھوٹ بولنے کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اگر ہم ایک آدمی کی سچائی کی طرف رہنمائی کرنا چاہتے ہیں اور ہماری خواہش ہے اور سچ بولنا کتنا خوشگوار عمل ہے تو ہمیں نئی اقتدار پیدا کرنی ہوں گی۔ ہمیں جرأت اور بے خوفی کی تعلیم دینی ہوگی، ہمیں سچ کو کھلے دل سے قبول کرنا ہوگا، وہ جیسا بھی ہو۔ سچ بڑا ظالم ہوتا ہے حالانکہ پوری دنیا یہی کہتی ہے کہ سچ بولنا چاہئے، دنیا سچ سننے کے لئے بھی تیار نہیں کیونکہ سچ بڑا ظالم ہوتا ہے، سخت اور بے رحم۔

جب تمہارے گھر کوئی آتا ہے، پہلے تو تم کچھ گھبراہٹ سی محسوس کرتے ہو لیکن یہ کہتے

ہوئے اسے خوش آمدید کہتے ہو۔ ''یہ ہماری خوش بختی ہے کہ تم آئے۔'' آنے والا جانتا ہے کہ اس کے آنے میں کون سی خوش بختی ہے۔ جب تم اس کے گھر جاتے ہو تو وہ اسی طرح خیر مقدمی کلمات ادا کرتا ہے۔

ہم نے اپنے اردگرد کی دنیا کو نمائشی اور مصنوعی بنا رکھا ہے۔ اس دنیا میں ہمارا ہدف تو سچ بولنا ہے لیکن ڈھانچہ جھوٹ سے تعمیر کیا ہوا۔ ہم سچ کو تسلیم نہیں کریں گے۔ کیا کوئی شخص سڑک پر چلتے ہوئے اپنی بیوی سے کہہ سکتا ہے کہ ''گزرتی ہوئی عورت کتنی خوب صورت ہے، میں اسے بے پناہ چاہتا ہوں؟'' حقیقتاً سڑک پر چلتے ہوئے ایک عورت خوب صورت دکھائی دے سکتی ہے۔ لیکن کیا وہ اپنی بیوی سے یہ کہہ سکتا ہے......؟ اور ہمارا معاشرتی ڈھانچہ مشورہ دیتا ہے کہ سچ بولا کرو۔

وہ دنیا بہت حسین ہوگی جس میں ہم اس کے اہل ہوں کہ بچوں کو سچ قبول کرنا سکھائیں۔ ہمیں اپنی بیٹیوں کو یقین دلانا چاہئے کہ یہ ضروری نہیں کہ صرف تمہیں ہی چاہا اور پسند کیا جائے۔ جب وہ ایک بیوی بنتی ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا شوہر کسی دوسرے کو بھی پسند کرتا ہو۔ وہ عجیب وغریب دن ہوگا، انتہائی پسندیدہ جب ایک شوہر یہ کہہ سکے کہ کوئی دوسری عورت بہت ہی خوب صورت لگ رہی ہے...... اور اگر بیوی میں اس بات کو سننے کی اہلیت ہو اور وہ پھر بھی شوہر کی رفیق رہے، تو گویا ان دونوں یعنی میاں بیوی کے درمیان محبت ہے۔ کل بیوی بھی کہہ سکتی ہے......

ایک ایسا ہی موقع آیا تھا۔ چار سال قبل، ممبئی میں، ایک عورت میرے پاس آئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بڑی مشکلات میں گرفتار ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میرا شوہر مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اس کی محبت کی کوئی انتہا نہیں ہے لیکن میں اس سے قطعی محبت نہیں کرتی۔ میں شادی سے پہلے جس شخص سے محبت کرتی تھی، اب بھی کرتی ہوں۔ بالکل ویسے ہی جیسے پہلے کرتی تھی۔ وہ شخص افریقہ میں رہتا ہے۔ شادی کے بعد اس سے نہیں مل پائی کیونکہ وہ ہر چار چھ برس بعد، صرف تین یا چار دن کے لئے آتا ہے۔

عورت نے کہا۔ ''میرا شوہر چونکہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے اس لئے میں تکلیف محسوس کرتی ہوں۔ اچھا ہوتا اگر میرا شوہر مجھ سے محبت نہ کرتا۔ میں اس سے محبت نہیں کرتی کیونکہ اس آدمی کا چہرہ میری نگاہوں میں ہر وقت گھومتا رہتا ہے۔ میں اس شخص کے بارے میں

کچھ نہیں کرسکتی' ناممکن' اس کے متعلق کوئی سوال ہی نہیں۔ میں اپنے شوہر سے معذرت چاہتی ہوں لیکن کر کیا سکتی ہوں؟ پھر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

میں نے اس سے کہا کہ تم اپنے شوہر کو سب کچھ بتادو۔ اس طرح اسے سکون مل جائے گا۔

اس نے جواب دیا۔ ''میرا شوہر کیا سوچے گا؟ اس کو مجھ سے شدید محبت ہے اور اب ہماری شادی کو بیس سال ہوچکے ہیں۔ یہ ابھی کی بات نہیں ہے لیکن میرا ذہن ابھی تک ویسا ہی ہے۔ اس شخص سے محبت میں۔''

میں نے پھر اسے سمجھانے اور راضی کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ایسا کرنا تو محبت کی دلیل ہوگی۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں تمہارے شوہر کو اچھی طرح جانتا ہوں' وہ میرے پاس آتا رہا ہے۔ وہ سخت خوف میں مبتلا تھی۔ بالآخر وہ پوری کہانی سنانے کے لئے تیار ہوگئی...... اور سب کچھ اسے بتادیا۔

اس کے بعد جب میں ممبئی گیا تو اس نے مجھ سے ملاقات کی۔ اس نے کہا۔ ''کچھ عجیب حیرت انگیز باتیں ہوئیں۔ مجھے تو اس کی توقع نہیں تھی۔ میری پوری کہانی سننے کے بعد' اسی دن سے اس کی محبت حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی۔ ہم اتنے قریب کبھی نہیں تھے اور میں کہانی سنانے کے بعد ہلکی پھلکی ہوگئی۔ اس کے بعد وہ شخص جب افریقہ سے آیا' میرے شوہر نے اسے بلایا اور ہمارے گھر میں ٹھہرنے کی دعوت دی۔ وہ ہمارے ساتھ سات دنوں تک رہا۔ ان سات دنوں میں میرے شوہر نے ہم دونوں کو تنہا رہنے کا کافی موقع فراہم کیا تاکہ ہم گفتگو کرسکیں اور مل سکیں۔ بہر حال ان سات دنوں میں ہی وہ شخص میرے ذہن سے نکل گیا اور بیس برسوں میں جو نہیں ہوا تھا وہ سات دنوں میں ہوگیا' اس کی وجہ میرے شوہر کی کھلے دل سے کی ہوئی کوشش تھیں کہ ایک دوسری کے قریب رہ سکیں۔''

''میرے شوہر نے ممکن حد تک گھر سے باہر رہنا شروع کردیا۔ جس کے نتیجے میں وہ شخص میرے ذہن سے نکل گیا کیونکہ میں نے اس شخص کے متعلق جو تصور کر رکھا تھا...... وہ ایک انتہائی عام سا آدمی تھا...... اور اپنے شوہر کو ایسی شکل میں دیکھا جیسا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ میں نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی بے پناہ محبت اسی طرح قائم رہی۔ میں اب اس کی محبت کو سمجھ چکی ہوں۔''

اگر ہم سچ کہہ دینے کے صحیح معنی بچوں کو نہ پڑھا سکے...... مجھے یقین ہے کہ جو واقعہ اس کی زندگی میں پیش آیا ہے کبھی نہ پیش آتا اگر اس نے سچ نہ بولا ہوتا۔ وہ شخص اس کے ذہن سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا اور مسئلہ ہی ختم ہوگیا اور اس سے بڑھ کر۔ انتہائی اہم اور قابل غور بات نہ ہوتی۔ اس کا شوہر اس کے بہت قریب آگیا۔

وہ آدمی چلا گیا کیونکہ معاملات صاف ہوگئے اور وہ دیوار جو اس کے اور شوہر کے درمیان کھڑی ہوئی تھی' گرگئی۔ کوئی احساسِ جرم نہیں رہا۔ کوئی زخم کوئی پوشیدگی ان دونوں کے بیچ نہیں رہی تھی۔ ہر چیز ہلکی پھلکی ہوگئی۔ جب ہم چیزوں کو چھپاتے ہیں تو وہی بوجھ بن جاتا ہے۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا پورا نظام جھوٹ کی بنیاد پر ہوتا ہے اور ہم سچائی کو کوئی جگہ نہیں دیتے لیکن اپنا ہدف سچ کو ہی بناتے ہیں۔ ہمارا سارا انتظام اسی طرح کا ہوتا ہے۔ سب کچھ کی بنیاد تشدد پر ہوتی ہے لیکن منزل یا ہدف عدم تشدد ہوتا ہے۔ پورا انتظام بے ایمانی پر ہے لیکن بات ایمانداری کی کرتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر جو ہوتا ہے وہ پرفریب ایمانداری ہوتی ہے جبکہ ذہن میں بے ایمانی بھری ہوتی ہے۔

وہ الفاظ ''ایمانداری مذہب ہے'' ہمارے دروازوں پر لکھا ہوتا ہے' یہ بھی بے ایمانی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بے ایمانی کے لئے ایمانداری استعمال ہوگی۔ لیکن ہم اس سے ناواقف ہیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کیونکہ ہم اپنے ہدف کا تعین مستقبل کے لئے رکھتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ تعلیم کا ایسا نظام ہو جس میں ہدف کا تعین روزمرہ زندگی پر ہو۔ مستقبل نام کی کوئی چیز نہیں۔ ہم آج زندہ ہیں یہی سب کچھ ہے۔ ہمیں تعلیمی اداروں میں ایسا ماحول پیدا کرنا چاہئے جو سمجھنے' تسلیم کرنے اور جاننے میں مددگار ہوسکے' سچائی کتنی بھی ناخوشگوار ہو' ہمیں چاہئے کہ صرف انہی لوگوں کا احترام کریں جو سچ بولتے ہیں۔ سچائی چاہے کتنی بھی ظالم دکھائی دے' عزت سچائی کو ہی ملنی چاہئے۔ ہماری تعلیم میں پہلے دن سے ہی کوشش ہونی چاہئے کہ سچائی کا علم دیا جائے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ ہمیں جاننا چاہئے کہ جھوٹ کو کس طرح اور کیوں بے نقاب کیا جائے۔ ہماری بھرپور کوشش ہونی چاہئے کہ سچائی کی عزت و وقار میں اضافہ ہو۔ جغرافیہ' ریاضی' کیمسٹری اور فزکس اتنے اہم نہیں جتنی کہ پُرغور آگہی ہے۔

مترجم کی دوسری کتابیں

1۔اینیمل فارم۔	جارج آرویل
2۔چارلس ڈارون کی خودنوشت۔	چارلس ڈارون
3۔خوش رہنے کا فن۔	دلائی لامہ
4۔تشاوو کے آدم خور۔	کرنل جے ایچ پیٹرسن
5۔عام سے لوگ۔	نجیب محفوظ
6۔چوراور کتے۔	نجیب محفوظ
7۔حضرت سلیمانؑ کا خزانہ۔	ایچ رائیڈر ہیگرڈ
8۔گرو رجنیش۔	وسنت جوشی
9۔دام فریب۔	جیمز ہیڈلے چیز
10۔جین ڈکسن۔	جین ڈکسن
11۔الکیمسٹ۔	پاؤلوکوئیلھو
12۔چھٹکارا۔	ژاں پال سارتر
13۔ویرونیکا کی خودکشی۔	پاؤلوکوئیلھو
14۔عظیم وراثت۔	چارلس ڈکنز
15۔شیکسپیئر کہانیاں	شیکسپیئر
16۔عقل وشعور۔	اوشو
17۔ویلکیریز۔	پاؤلوکوئیلھو
18۔انمول موتی۔	جان اسٹینبک
19۔شکنجہ۔	جیمز ہیڈلے چیز
20۔دوسرے جہان کی آوازیں۔	نجیب محفوظ

☆☆☆